ISSN 2321-4627

جنوری 2023ء

-/15روپے

# ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی وسائنسی جریدہ

**QAUMI ZABAN** Monthly, Hyderabad

سکندر علی وجد



مولانا محمد انوار اللہ فاروقی

بانی جامعہ نظامیہ

جناب کے۔ چندرا شیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ تلنگانہ نے ہر ایکسلنسی صدر جمہوریہ ہند محترمہ دروپدی مرمو کا بیگم پیٹ ایرپورٹ پر استقبال کیا۔
اس موقع پر لی گئی تصویر میں محترمہ تملی سائی سوندر یہ راجن عزت مآب گورنر تلنگانہ بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

ہر ایکسلنسی عزت مآب صدر جمہوریہ ہند محترمہ دروپدی مرمو کی حیدرآباد آمد کے موقع پر جناب کپولا ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود و بہبودیٔ معمر شہریان حکومت تلنگانہ نے گلدستہ پیش کیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب کے۔ چندرا شیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

جناب کپولا ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود و بہبودیٔ معمر شہریان حکومت تلنگانہ نے حج ہاؤز میں آن لائن قضاۃ سیکشن کا افتتاح کیا۔
اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی، جناب محمد مسیح اللہ خان چیرمین تلنگانہ وقف بورڈ، جناب امتیاز اسحٰق چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن، جناب شاہنواز قاسم آئی پی ایس و دیگر دیکھے جاسکتے ہیں

# قرینہ


| | | | |
|---|---|---|---|
| ہم کلامی | : | بی۔ شفیع اللہ آئی ایف ایس ڈائرکٹر/سکریٹری (FAC) | 4 |
| اپنی بات | : | محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی | 5 |

**یادرفتگاں**

| | | |
|---|---|---|
| بانی جامعہ نظامیہ مولانا محمد انوار اللہ فاروقیؒ | ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساؔس | 6 |
| نظم فرزند جامعہ عثمانیہ کا شاعر سکندر علی وجدؔ | ڈاکٹر محمد انورالدین | 14 |

**مضامین**

| | | |
|---|---|---|
| اساتذہ جامعہ عثمانیہ | پروفیسر محمد علی اثر | 21 |
| حیدرآباد میں اردو ناول کے پچیس سال | پروفیسر حبیب نثار | 30 |
| اردو کے نامور شعراء کے کلام میں حب الوطنی | ڈاکٹر محمد موسیٰ اقبال | 35 |
| غزل کا فن | ڈاکٹر واجدہ بیگم | 41 |
| فرینسس ڈبلیو پرچٹ اور اردو زبان وادب | ڈاکٹر ابوشہیم خان | 43 |
| اُردو ہندی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا اظہار | محمد مبین آصف | 49 |
| حیدرآباد میں اردو صحافت کے نقوش | محمد ناہید علی | 55 |

**تعلیم وروزگار**

| | | |
|---|---|---|
| ہندوستان میں تعلیمی مساوات اور ایکویٹی: ایک مطالعہ | ڈاکٹر محمد اطہر حسین | 58 |
| معلم کی تدریسی حکمت عملیاں | ڈاکٹر مصباح انظر | 62 |

**سائنس وٹکنالوجی**

| | | |
|---|---|---|
| سائنس اور انسان | محمد خلیل سائنسداں | 68 |
| افراطِ کائنات۔ ہماری کائنات کا حیرت انگیز مظہر | محمد عبدالمعز، ڈاکٹر رضوان الحق انصاری | 72 |

**افسانہ**

| | | |
|---|---|---|
| بجھ گئی شمع آرزوئے زیست | خیرالنساء علیم | 76 |

**حصہ نظم**

| | | | |
|---|---|---|---|
| غزلیں | سردار سلیم | / محمود شاہد | 80 |
| | اطیب اعجاز | / طاہر سعود کرتپوری | 81 |
| | سعد اللہ خان سبیلؔ | | 82 |
| مزاحیہ نظم | فرید سحر | | 82 |


oOo


ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، ثقافتی ترجمان

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد :08 شمارہ :01 جنوری 2023ء

زیرنگرانی

محمد خواجہ مجیب الدین

صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر

بی۔ شفیع اللہ آئی ایف ایس

ڈائرکٹر/سکریٹری (FAC)

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

**ناشر و طابع**

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی

حیدرآباد-500 001 (تلنگانہ)

**مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی**

ترتیب وتزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : 84


قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆


Printed by B. Shafiullah IFS and published by B. Shafiullah IFS on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana. Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

# ہم کلامی

ماہ جنوری 2023ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔تمام قارئین قومی زبان اور عوام الناس کو نئے سال 2023ء کی مبارکباد اور نیک تمنائیں۔ مجھے حکومت نے اردو اکیڈیمی کے ڈائرکٹر/سکریٹری کی ذمہ داری سونپی ہے۔ میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج اور اس کے فروغ کے سلسلہ میں دی گئی اس ذمہ داری کو نبھانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔اس کے ساتھ ساتھ میں اس بات کی امید کرتا ہوں کہ ہم نئے سال کی ابتداء نئے عزائم کے ساتھ کریں گے۔اپنے ملک وقوم کی ترقی، اپنی تہذیب وتمدن اور قومی یکجہتی کی بقا، تعلیم کو عام کرنے اور اپنی ریاست اور ملک سے ناخواندگی کو دور کرنے اور خود کو اور اپنی نئی نسل کو نئے دور کے مطابق ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آج دنیا ترقی کی طرف گامزن ہے، سائنس وٹکنالوجی میں ہر ملک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ہے۔ اسی طرح دوسرے میدانوں میں مسابقت کا بھی دور ہے۔تعلیم میں ہو کہ کاروبار میں، زراعت میں ہو یا صنعت وحرفت میں، ہر جگہ مسابقت ہے۔تعلیم کے میدان میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر کوئی اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس میدان میں اقلیتوں کا کتنا حصہ ہے۔ خاص کر مسلمان اس میدان میں کتنے آگے آرہے ہیں، اب تک کی مختلف سروے رپوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان خواندگی کے میدان میں دوسرے طبقات سے بہت پیچھے ہیں۔ایسے میں نئے سال سے ہماری اولین کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہم تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کریں، اس کے لئے ترک تعلیم کرنے والے طلباء کو پھر سے مدارس میں داخلہ دلوانے کی کوشش کریں۔ ہماری حکومت نے اس سلسلہ میں ایک بہترین ذریعہ اقامتی اسکولوں اور کالجوں کی صورت میں فراہم کیا ہے۔ان مدارس وکالجس سے فائدہ اٹھائیں۔حکومت نے ریاست بھر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ اس کی تعمیل میں سرکاری دفاتر میں اردو آفیسرس کا تقرر بھی کیا گیا ہے۔ہمیں چاہیے کہ ان سہولتوں سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے اپنی زبان اردو کی بقا کی کوشش کریں۔اپنے بچوں کو اردو سکھائیں، انہیں اردو میڈیم اسکولوں میں داخلہ دلوائیں یا کم از کم دوسری زبانوں کے ساتھ ضروری سبجیکٹ کے طور پر اردو پڑھائیں اور اپنی مادری زبان کی حفاظت کریں۔تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے حکومت کی ایک اسکیم ''اردو اسکولس کو انفراسٹرکچر کی فراہمی کے لئے مالی اعانت'' کو دوبارہ جاری کیا ہے۔اس سلسلہ میں سال 2022 کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔اولیاء مدارس اس خصوص میں 31 جنوری 2023 تک درخواستیں داخل کرسکتے ہیں۔درخواست فارم صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی چوتھی منزل حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد اور اضلاع کے متعلقہ ڈی ای او کے دفاتر سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔اس اسکیم کی امید ہے کہ بہت جلد تکمیل ہوجائے گی۔اس موقع کو غنیمت جان کر جن اسکولس میں تعلیم کا سلسلہ رکا ہوا تھا یا کچھ دشواریاں تھیں انہیں دور کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی اپنے ادبی ولسانی، تعلیمی وتہذیبی سرگرمیوں میں اُردو زبان وادب کے فروغ، ترویج وترقی کی مختلف اسکیمات کو روبہ عمل لارہی ہے اور سالانہ اسکیمات کو اپنے وقت پر پورا کرنے کی بھرپور سعی کررہی ہے۔اکیڈیمی کی جن اسکیمات کا اعلان ہوا ہے اس میں بیسٹ اُردو ٹیچر ایوارڈ برائے سال 2019-20 اور 2020-21ء، چھوٹے اُردو اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کی مالی اعانت برائے سال 2022، اُردو مصنفین کے مسودات کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت برائے سال 2021 اور اُردو مطبوعات پر انعامات برائے سال 2021 کے لئے درخواستوں کی وصولی کا سلسلہ جاری ہے، ان کی آخری تواریخ کے اختتام کے ساتھ ہی ان اسکیمات پر عمل آوری کا کام شروع ہوجائے گا۔اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام نئے سال کی ڈائری اور کیلنڈر بھی شائع کئے جارہے ہیں اور حیدرآباد میں جاری 82ویں کل ہند صنعتی نمائش میں اردو اکیڈیمی کا بک اسٹال بھی قائم کیا گیا ہے۔

بہرحال ہماری کوشش ہوگی کہ فروغ اردو کی تمام اسکیمات جلد اپنے وقت پر تکمیل کو پہنچ جائیں۔ ہمارے کاموں میں مزید بہتری کے لئے آپ محبان اردو کے مشوروں کی ضرورت ہے۔آپ کے زرین مشوروں کی قدر کی جائے گی۔

بی۔شفیع اللہ آئی ایف ایس
ایڈیٹر

# اپنی بات

نیا سال 2023 تمام قارئین ومحبان اردو کو مبارک ہو۔ امید کہ نیا سال ہمارے ملک کے لئے‘ ریاست کے لئے نئی سوغات لائے اور ہم ہر میدان میں ترقی حاصل کریں۔

ہمارے معاشرے میں ہم جہاں اپنی تہذیب وتمدن میں عید وتیوہار‘ پیدائش واموات کے موقع پر خوشی وغم کا اظہار کرتے ہیں ویسے ہی گزرے ہوئے سال کی یادوں کے ساتھ آنے والے نئے سال کی آمد پر خوشیاں مناتے ہیں‘ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں‘ دفاتر واسکولس میں تہذیبی وثقافتی پروگرامس اور کھیلوں کے مقابلے بھی منعقد کئے جاتے ہیں۔ عمارات کو روشنیوں سے سجایا جاتا ہے‘ اور بھی کئی طریقوں سے نئے سال کی آمد کا استقبال کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن کیا ہم نے کبھی اپنے گزرے ہوئے کل اور آنے والے دنوں کے بارے میں کوئی منصوبہ بندی کی ہے یا کوئی پروا گرام بنایا ہے؟ جس میں ناخواندگی کو دور کرنے اور تعلیم کو عام کرنے کا کوئی منصوبہ شامل ہے۔ آج ہم جب اپنے اطراف نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیم کے میدان میں اور مسابقت کی دوڑ میں دیگر طبقات سے بہت پیچھے چل رہے ہیں۔ ہمارے بچوں نے گروپ 1‘ 2‘ 3 اور 4 کے مسابقتی امتحانات کے لئے کہاں تک تیاری کی ہے۔ جب کہ حکومت کی طرف سے یہ سہولت دی گئی ہے کہ انگریزی اور تلگو کے ساتھ ساتھ اردو طلباء بھی یہ امتحانات اپنی زبان میں لکھ سکتے ہیں۔ اس کے لئے مواد بھی اردو زبان میں فراہم کیا جارہا ہے۔ اردو طلباء کے لئے یہ بہت اچھا موقع ہے کہ اس مواد کو حاصل کریں اور مسابقتی امتحانات میں اپنی شرکت درج کریں اور اس دوڑ میں شامل ہو کر خود کو منوائیں اور ریاست وملک کا نام روشن کریں۔

ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعلیٰ جناب کے۔ چندر شیکھر اراؤ ریاست کی ترقی کی راہ میں جہاں دیگر طبقات کے مسائل کے حل کو ضروری سمجھتے ہیں وہیں اقلیتی طبقات کے معاشی‘ سماجی اور تعلیم وروزگار کے مسائل سے بھی بخوبی باخبر ہیں اور ان مسائل کے حل کے لئے بھی کوشاں ہیں۔ اس خصوص میں حکومت نے کئی اسکیمات و پروگرامس جاری کئے ہیں جن میں روزگار کے لئے مختلف خود روزگار پروگرامس‘ تعلیم کے فروغ کیلئے اقلیتی اقامتی مدارس وکالجس کا قیام‘ ابتدائی جماعتوں تا پوسٹ گرایجویشن اسکالرشپ‘ بیرون ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کے لئے اسکالرشپس اور اسی طرح اردو اکیڈیمی کے ذریعہ فروغ اردو کی کئی اسکیمات جاری کی گئی ہیں۔ اردو اکیڈیمی ان اسکیمات کی عمل آوری میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس خصوص میں اردو اکیڈیمی کی جن اسکیمات کا اعلان ہوا ہے اس میں سال 2019-20 اور 2020-21ء کے بیسٹ اُردو ٹیچر وبیسٹ ایوارڈ‘ اُردو مصنفین کے مسودات کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت برائے سال 2021‘ سال 2022ء کے لئے چھوٹے اُردو اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کی مالی اعانت‘ سال 2021 کی اُردو مطبوعات پر انعامات کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ اسی طرح اردو اکیڈیمی کے پروگرامس اور اسکیمات کی تشہیر کے لئے اس سال کل ہند صنعتی نمائش میں ایک بک اسٹال قائم کیا گیا ہے جس میں ادبی‘ علمی‘ تاریخی‘ سماجی‘ معاشرتی ودیگر معلوماتی کتب رکھی گئی ہیں۔ اُردو اکیڈیمی کی جانب سے اس سال کی ڈائری اور کیلنڈر بھی شائع کئے جارہے ہیں۔

بہر حال ہماری کوشش رہے گی کہ اردو زبان وادب کی ترقی‘ ترویج اور تحفظ کے سلسلہ میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ نئے سال کی آمد پر اس خصوص میں کچھ نئے منصوبے بھی بنائے جائیں گے۔ جس کے لئے ماہرین اساتذہ واسکالرس اور محبان اردو کے مشوروں کی ضرورت ہوگی۔ آپ اپنے زرین مشوروں سے ضرور نوازتے رہیں۔

محمد خواجہ مجیب الدین

محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

# بانی جامعہ نظامیہ مولانا محمد انوار اللہ شاہ فاروقی انورؔ

بانی جامعہ نظامیہ حیدرآباد شیخ الاسلام المخلب بہ فضیلت جنگ محمد انوار اللہ شاہ فاروقیؒ جہاں علوم اسلامیہ کے متبحر عالم تھے، وہیں اردو زبان وادب کے حوالے سے بھی ان کا شمار اردو زبان وادب کے خاموش اور عظیم المرتبت خدمت گزاروں میں ہوتا ہے، انہیں علم وادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا، ان کے والد عربی وفارسی کے عالم تھے، وہ ۴ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ بمقام ناندیڑ پیدا ہوئے۔ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں حفظ کلام اللہ مکمل فرمالیا تھا، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی، مولوی محمد فیاض الدین سے فقہ کی کتابیں پڑھیں اور مولانا عبدالحئی فرنگی محلی سے بھی فقہ اور معقول کی تکمیل کی۔

مولانا ایک عالم، صوفی، مفکر، دانشور، فلسفی، متکلم، فقیہہ، محدث اور مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ادیب وشاعر اور ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی کے علمی وادبی کارناموں میں ان کی شاعری بھی اہمیت کی حامل ہے، وہ انورؔ تخلص فرماتے تھے، مولانا انوار اللہ نے شعر گوئی کا آغاز انوار احمدی کے منظوم ترجمہ سے کیا جو بانسٹھ بندوں پر مشتمل مسدس کی ہیت میں ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، معجزات اور میلاد شریف کے موضوعات شامل ہیں، مولانا نے مدینہ میں قیام کے دوران ان موضوعات کو احادیث اور سیرت کی کتابوں سے منتخب کر کے منظوم کیا تھا، جس کی تشریح خود مولانا موصوف نے سادہ اردو نثر میں کی اور اپنے پیر ومرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو حرف بہ حرف سنایا، حاجی صاحب نے کمال مسرت سے اس کتاب کا نام ''انوار احمدی'' تجویز کیا اور توصیفی کلمات سے نوازا۔

مولانا نے اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد تیسرا حج کیا، اس سفر میں انہوں نے تین سال مدینہ منورہ میں گزارے، اس وقت مولانا کی زندگی میں ایک کرب کی حالت پیدا ہوگئی تھی، اس حالت کرب میں مولانا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے تعلق قلبی کو بڑھایا اور اس کے اظہار کے لئے شاعری کا سہارا لیا، چنانچہ اس عرصے میں آپ نے جو اشعار لکھے، ان کا ہر لفظ حب رسول کی صدا دیتا ہے، انہیں اشعار کی نثری وضاحت کا نام انوار احمدی ہے، اس کے علاوہ مولانا نے فارسی میں بھی چند نعتیہ غزلیں کہی تھیں، جن کو انوار احمدی میں شامل کیا، اس کتاب میں مظفر الدین معلّی کا قطعہ تاریخ بھی شامل ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوئی۔

انوار احمدی کے شعری متن کے علاوہ مولانا کا ایک اور مجموعۂ کلام ''شمیم الانوار'' کے نام سے مولانا کے انتقال کے بعد مطبع اشاعت العلوم شبلی گنج حیدرآباد سے شائع ہوا، اس مجموعے میں فارسی کی چوبیس نعتیہ غزلیں، ایک نعتیہ قصیدہ اور سینتیس (۳۷) اشعار شامل ہیں، ان کے علاوہ اردو کی ایک مثنوی جس کے اشعار کی تعداد اٹھائیس (۲۸) ہے اور دس غزلیں بھی اس میں شامل ہیں، جن میں مولانا نے تصوف و اخلاق کے موضوعات کو شعری لوازمات کے ساتھ پیش کیا ہے، علاوہ ازیں کلام انورؔ ''انوار الانوار'' (قلمی نسخہ مخزونہ درگاہ شاہ راجو حسینی) میں فارسی غزلوں کے ساتھ اردو کی دو غزلیں بھی شامل ہیں۔

مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی رچے ہوئے شعری ذوق کے حامل تھے، ان کے شعری ذوق کے متعلق مفتی رکن الدین یوں رقم طراز ہیں:

''مولانا علیہ الرحمہ باضابطہ شاعر نہیں تھے، تصوف سے لگاؤ کے باعث جو خیالات اور جذبات اٹھتے تھے، ان کو کبھی کبھی نظم فرمادیا کرتے تھے، آپ کا کلام یقیناً عام مذاق کے مطابق نہ ہوگا، البتہ وہ لوگ جو صوفیانہ مذاق رکھتے ہیں ضرور اس سے حظ اٹھائیں گے، کلام کا اکثر حصہ توحید ونعت میں ہے''۔

مشہور محقق محمد اکبر الدین صدیقی بھی مولانا انوار اللہ شاہ کی شاعری کے معترف تھے، ان کی شاعری کے بارے میں وہ اس طرح

یادرفتگاں

اظہار خیال کرتے ہیں:

''مولانا کہنہ مشق شاعر نہ تھے، لیکن جذبات کے اظہار کے لئے جو تصوف میں ڈوبا ہوا تھا بہترین ذریعہ اشعار ہیں اور اس بنا پر وہ مجبوراً شعر کہتے تھے''۔

اپنی شاعری کے بارے میں خود مولانا کی رائے یہ تھی کہ:

ہر چند فن شاعری میں نہ کسی سے تلمذ ہے نہ مہارت، نہ اہل ہند کے محاورات سے واقفیت مگر صرف اس لحاظ سے کہ یہ خدمت غالباً، مناسب مقام ہے اور تعجب نہیں کہ اسلام سے اس کو کچھ فائدہ حاصل ہو۔

مولانا کا یہ کہنا کہ فن شاعری میں مہارت نہیں، محاورت اہل ہند سے واقفیت نہیں وغیرہ یہ سب از راہِ انکساری تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا شاعری کے سارے مسائل ولوازمات سے واقف تھے، مولانا کس درجے کے شاعر تھے، اس بابت ابوالخیر سنج نشین رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''وہ اپنے عہد کے علمی ہمہ دانست بہت اچھے نمونہ تھے اور عربی، فارسی اور اردو کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے''۔

مولانا کے مزاج میں نثر پر قابو کے باوصف، شعر کہنے کی بھی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی، مولانا انور کی شاعری برائے شاعری نہیں بلکہ برائے عبادت تھی، انہوں نے اپنے مقصد شاعری کا ذکر ایک نعتیہ مسدس میں اس طرح کیا ہے: ؎

لکھا اس کو نظم میں ہر چند میں شاعر نہیں
کیوں کہ خوش ہوتے تھے اکثر نظم ہی سے شاہِ دیں
ذکر ختم المرسلیں اس نظم سے مقصود ہے
جو ازل سے تا ابد ممدوح اور محمود ہے

مولانا انور نے اپنی غزلوں کے لئے عموماً ان بحروں کا انتخاب کیا ہے جن سے کلام میں روانی اور نغمگی پیدا ہوتی ہے اور ایسے موزوں الفاظ کا استعمال کیا ہے جس سے شعر میں موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے، مولانا انور کی شاعری کی آواز آواز ربانی کا احساس دلاتی ہے، مولانا انور کے کلام میں قرآنی طرز کہیں لفظوں کے آہنگ سے پیدا ہوتا ہے کہیں ردیف وقافیے سے اور کہیں بحروں کے حسن انتخاب سے واضح ہوتا ہے، اس مقصد کے حصول میں مولانا انور نے بحر متقارب کے علاوہ بحر ہزج، بحر مضارع اور بحر رمل کی مختلف شکلوں سے اپنے کلام میں موسیقی اور ترنم کو پیدا کیا ہے۔ جیسے: ؎

جہاں میں ہیں جلوے عیاں کیسے کیسے
ہیں اسرار دل میں نہاں کیسے کیسے
ذرا دیکھو انور کہ انوارِ غیبی
نہاں کس قدر ہیں عیاں کیسے کیسے

مولانا انور کی شاعری کے موضوعات وسیع اور متنوع ہیں، انہوں نے تصوف واخلاق، حب رسول، مناظر قدرت پند ونصائح جیسے موضوعات پر اشعار کہے ہیں، مولانا انور نے شاعری کے ذریعہ اسرارِ حق کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، ان کے شعری سرمائے میں معرفت اور درسِ عبرت کے پہلو پائے جاتے ہیں، جیسے: ؎

عارف کو فہم آیۂ تخلیق کے لئے
اوراق گل ہیں نسخۂ تفسیر ایک ایک
ہاتھ آئے جس کو سلسلۂ زلف عنبریں
توڑے تعلقات کی زنجیر ایک ایک

مولانا انور کے موضوعات کا تعلق شاعری کے داخلی پہلو سے ہے، انہوں نے حیات انسانی اور کائنات کے مختلف موضوعات اور مسائل کو موضوع سخن بنایا ہے، جیسے: ؎

یک روش دور زمانہ کا نہیں رہ سکتا
رکھی رہتی ہے صراحی بھی کبھی جام سے دور

خوف آخرت، سزا اور جزا کا تصور بھی ان کے کلام میں ملتا ہے جیسے: ؎

کیا حال ہو جو حشر کے دربارِ عام میں
بہر سزا سنائیں گے تقصیر ایک ایک

ہر شئے میں خدا کی جلوہ گری ہے، انہوں نے اس نکتہ کی گرہ کشائی اس طرح کی ہے: ؎

ہر چیز میں ہے صنعتِ خلاق جلوہ گر
اس وجہ سے ہے قابل تصویر ایک ایک

مولانا انور نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لازوال قدروں کے حامل اشعار کہے ہیں: ؎

کی صدقِ دل سے جس نے اطاعت رسول کی
عالم میں اس کی کرتا ہے توقیر ایک ایک
طیبہ کی سرزمیں کی ہوس کو ہے قدر کیا
خاشاک و خاک واں کی ہے اکسیر ایک ایک

تصوف و معرفت کے مسائل بھی ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں، مولانا انور کا صوفیانہ رنگ کچھ اس طرح ہے: ؎

عدم شکل ہستی میں بن بن کے آیا
کہیں کیا ہوئے امتحاں کیسے کیسے
ذرا دیکھو انور کہ انوارِ غیبی
نہاں کس قدر ہیں عیاں کیسے کیسے

بقول حالی محاورہ اگر عمدہ طور پر باندھا جائے تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے، مولانا انور کے کلام میں بھی محاورہ کا لطف ملتا ہے، اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

دل ٹھکانے نہیں ہے کیا باعث — وہ کسی زلف میں پھنسا تو نہیں
ہاتھ آئے جس کو سلسلۂ زلف عنبریں — توڑے تعلقات کی زنجیر ایک ایک

یادرفتگاں

مولانا انور کی شاعری کا خارجی پہلو صنائع بدائع کے ساتھ ساتھ دیگر شعری خصوصیات کا حامل ہے، جن کی بنیاد پر انہیں ایک قادرالکلام شاعر کہا جاسکتا ہے، مولانا انور کے اشعار میں صنائع بدائع کا استعمال بھی شعری حسن کو بڑھا دیتا ہے، اس سلسلہ میں چند مروجہ صنعتوں کے اشعار درج کئے جاتے ہیں: ؎

حسن تعلیل ؎ یہاں آتے ہی رو دیا بے تکلف
جدائی کا ہوتا ہے غم پہلے پہلے

مراعات النظیر ؎ عشاق کے دلوں کو پھنسانے کا دام ہے
ہر تار موئے زلف گرہ گیر ایک ایک

صنعتِ تضاد ؎ سیر عارف کی بدایت ہے نہایت کا مقام
دائرہ ہی نہیں آغاز ہے انجام سے دور

ایہام ؎ زلف کے دام میں دانا بھی پھنسے جاتے ہیں
کون ایسا ہے بھلا جو رہے اس لام سے دور

مولانا انور کو عربی اور فارسی زبانوں پر غیر معمولی عبور حاصل تھا، اس لئے انہوں نے ایسی تراکیب بھی ایجاد کی ہیں جن کے ذریعہ وہ مفہوم جو کئی جملوں میں ادا نہیں ہوسکتا چند الفاظ سے ادا ہو جاتا ہے:

رحم و اظہارِ وفا، خوئے دلآرام سے دور
صبر آسودہ دلی عاشق ناکام سے دور

مولانا انور جہاں ایک بلند پایہ عالم و خطیب تھے، وہیں ایک شعر و ادب کے خاموش خادم بھی تھے، انہوں نے اپنے اندرون کے پاکیزہ جذبات کے اظہار کے لئے صالح مقصد کے پیش نظر شاعری کا سہارا لیا اور اردو نظم و نثر میں وہ نمایاں خدمات انجام دیں کہ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی شناخت کو استحکام ملا۔

ان کی کتاب ''انوار احمدی'' کے منظوم ترجمہ سے ان کی شعری خدمات کا آغاز ہوا۔ مگر ان کا باضابطہ شعری مجموعہ شمیم الانوار ہے، جو اولاً ۱۳۳۶ھ میں مولوی حافظ ولی الدین صاحب فاروقی مہتمم دفتر اشاعت العلوم حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہوا جو ۳۳ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں صفحہ نمبر ۲۶ تک فارسی اور باقی اردو کلام ہے، پھر محمد فصیح الدین نظامی کی مساعی جمیلہ اور حسن ترتیب سے ازسرنو مولانا انور کے کلام کو کتابی شکل موسوم بہ ''دیوان انور'' دی گئی، ۲۰۰۳ء م ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ میں شیخ الاسلام لائبریری اینڈ ریسرچ فاؤنڈیشن حیدرآباد کے زیر اہتمام جس کی اشاعت عمل میں لائی گئی، اس مجموعہ میں حضرت مولانا کے تمام کلام کو یکجا کیا گیا اور فارسی غزلوں اور اشعار کے ترجمہ کی خدمت مشہور بزرگ ادیب و شاعر حضرت قاضی سید شاہ اعظم علی صوفی قادری مدظلہ کی ذات گرامی نے انجام دی جس کی وجہ سے اس کا وقار و اعتبار اور بڑھ کر یہ مفید عام و خاص ہوگئی اور اب ترجمہ کی مدد سے حضرت کے فارسی کلام کا نہ صرف مطالعہ کیا جاسکتا ہے بلکہ مولانا انور کی فکر بلند نیز ان کے مزاج و منہاج کو بھی بآسانی سمجھا جاسکتا ہے، علاوہ ازیں اس مجموعہ میں مولانا انور کا وہ کلام بھی جمع کیا گیا جو شمیم الانوار (پہلے شعری مجموعے) میں نہ تھا بلکہ مولانا کی مختلف دیگر تصانیف میں مضامین کی نسبت سے بکھرا پڑا تھا، اس طرح یہ دیوان انور اب جامع ہوگیا ہے، ''عرض ترجمہ'' مضمون کے تحت حضرت سید شاہ اعظم علی صوفی قادری مدظلہ رقم طراز ہیں:

''آپ کی ہمہ پہلو شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن تھی، مفتی، محدث، مفسر و مفکر، مصنف و مؤلف، خطیب و ادیب اور صوفی و عارف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قادرالکلام شاعر و سخنور بھی تھے کہ جن کے عشق رسول میں ڈوبے ہوئے کلام کو پڑھ کر علامہ جامی قدس سرہ السامی کے جذبۂ وارفتگی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، آپ کی کثیر تصانیف سے قطع نظر آپ کے اردو فارسی کلام کے مطالعہ سے جہاں ایمان کی شیرینی و حلاوت ملتی ہے، وہیں عشق و سرمستی اور شیفتگی و سرشاری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے''۔

اسی طرح عصر حاضر کے مشہور و مقبول، نامور اور معتبر ادیب و شاعر ناقد اور عروضی پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے مولانا انور کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا یوں اظہار کیا:

''علامہ انوار اللہ انور کے کلام میں کلاسیکی پختگی اور مشاقی قدم قدم پر نمایاں ہے، زبان نہایت نکسالی اور بامحاورہ ہے''

مولانا کی غزلوں میں حسن و عشق کے اسرار، رندی و سرمستی کے آثار اور بلا کی شوخی پائی جاتی ہے، جیسے: ؎

نہ خنجر پاس ہے ان کے نہ وہ شمشیر رکھتے ہیں
مگر ابرو کی جنبش میں عجب تاثیر رکھتے ہیں
نہیں رہتا ہے دل قبضے میں ان کی ہم کلامی سے
نہیں معلوم باتوں میں وہ کیا تاثیر رکھتے ہیں

مولانا انور کے یہاں دینی، اسلامی، تعمیری اور فکری پہلوؤں پر بھی سخن کی روشنی اور مہک ملتی ہے، جن کے ذریعہ سے معرفت الٰہی کے وہ خزانے ہاتھ آتے ہیں کہ جن سے راہِ سلوک کی منازل بآسانی طئے ہو جاتی ہیں۔ جیسے ؎

ہر چیز میں ہے صنعتِ خلاق جلوہ گر
اس وجہ سے ہے قابل تصویر ایک ایک
عارف کو فہم آیۂ تخلیق کے لئے
اوراق گل ہیں نسخۂ تفسیر ایک ایک
جوانی ڈھلتے ہی ہر دم خدا یاد آنے لگتا ہے
پئے سجدہ ہوئے جاتے ہیں خم آہستہ آہستہ
سیر عارف کی بدایت ہے نہایت کا مقام
دائرہ میں نہیں آغاز ہے انجام سے دور

مولانا انور نے اپنے پاکیزہ افکار کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے لئے چھوٹی چھوٹی بحروں کا بھی سہارا لیا ہے اور سہل ممتنع انداز میں بہترین اور معیاری اشعار کہے ہیں جن سے ان کی شاعرانہ قدرت اور کلام کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو: ؎

ہمارے لئے اب غذا وہ بنی ہے
جسے ہم سمجھتے تھے لم پہلے پہلے

یادرفتگاں

ذرا دیکھو انورؔ کہ انوارِ غیبی
نہاں کس قدر ہیں عیاں کیسے کیسے

اسی طرح دیوان انورؔ میں مولانا انورؔ کا ایک منظوم مسدس بنام ''انوارِ احمدی'' ہے جس میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد شریف سے متعلق مضامین کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے، چنانچہ اس کے بارے میں انوارِ احمدی کتاب کی ابتداء میں حضرت انورؔ نے یوں لکھا ہے:

''جس زمانہ میں آقائے دارین نے بنظر کمال بندہ پروری اس ناچیز کی حضوری افضل البلاد مدینہ طیبہ زاد ہا اللہ شرفاً میں منظور فرمائی تھی، چند روز ایسے گزرے کہ کوئی کام درس و تدریس وغیرہ کا متعلق نہ رہا، چوں کہ نفسِ ناطقہ بیکار نہیں رہتا، یہ بات دل میں آئی کہ چند مضامین میلاد شریف وفضائل ومعجزات سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتب احادیث وسیر سے منتخب کر کے منظوم کئے جائیں، ہر چند فن شاعری میں نہ کسی سے تلمذ ہے نہ مہارت، نہ اہل ہند کے محاورات سے واقفیت مگر صرف اس لحاظ کہ یہ خدمت غالباً مناسب مقام ہے اور تعجب نہیں کہ اہل اسلام کو اس سے کچھ فائدہ حاصل ہو، چند اشعار لکھے'' اس منظوم مسدس میلاد شریف کے چند بند ملاحظہ ہوں:

شکرِ حق اس نظم میں ہیں وہ مضامیں دلپذیر — جس سے ایماں تازہ ہو اور ہوں دل اعدا پہ تیر
ہے حدیثوں کا جو یہ مضموں بلاریب و نکیر — جو محدث ہیں وہ اس کو مان لیں گے ناگزیر
لکھا اس کو نظم میں ہر چند میں شاعر نہیں — کیوں کہ خوش ہوتے تھے اکثر نظم ہی سے شاہِ دیں
تھا یہی لم جو مد حساں کے تھے روح الامیں — کعب اور ابن رواحہ کو اسی کا تھا یقیں

ذکر ختم المرسلیں اس نظم سے مقصود ہے
جو ازل سے تا ابد ممدوح اور محمود ہے

اس طرح حضرت فضیلت جنگ کی ایک اور شاہکار نظم ''خدا کی قدرت'' ہے، جس میں خدا کی طاقت وقوت، انبیاء کرام کا احترام اور اولیاء کرام کی عظمت ومرتبت، ان سے تعلق اور ان سے استفادہ کا بیان ہے جس کے چند اشعار یوں ہیں ؎

خدا کی قدرت کامل عیاں ہے
اسی کی ساری قدرت ہے جہاں ہے
اسی نے دی ہے عظمت انبیاء کو
کرامت بخشی اس نے اولیاء کو

مولانا انورؔ نے نثری نمائندگی کرتے ہوئے بھی کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں انوارِ احمدی اور انوار الحق وغیرہ شامل ہیں، علاوہ ازیں انہوں نے کتب خانہ شیخ الاسلام اور کتب خانہ محمودیہ سے بہت سارے عربی وفارسی مخطوطات کی نقل کروائی، جن کی تفصیل یوں ہے:

۱) کنز الاعمال (حدیث کی کتاب، سات جلدوں میں)
۲) جامع معاہدہ امام اعظم
۳) جوہر نقی علی بیہقی
۴) احادیث قدسیہ (۱۰)

آرٹیکلز

مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی نے اردو زبان میں مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں، نثر میں وہ ادب کی جملہ خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کہنے کے فن سے پوری طرح واقف ہیں، ان کی نثر میں خیالات کی صحت، رفعت، درستی، بلندی اور ان کا تسلسل پایا جاتا ہے، ذیل میں مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی کی نثری تصانیف کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے:

**انوار الحق :** شیخ لاسلام کی تصانیف متعدد مرتبہ شائع ہوئی ہیں، انہیں میں سے انوار الحق بھی ہے، جو ۱۹۹۷ء، ۱۴۱۸ھ میں مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی طرف سے طلبہ جماعت عالم اول کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے، یہ کتاب کل ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب اردو نثر میں ہے جو دراصل قادیانی فرقہ کی طرف سے موجود کتاب تائید الحق کے جواب میں لکھی گئی ہے، جس میں امتیاز حق و باطل، امر بالمعروف کے شرائط، اہل ہوا سے دور رہنے کا حکم، قصۂ خوارج، تاجروں سے دین کی تائید، فضائل امت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خوف فتنہ دجال، موضوعیت احادیث، دجال اعور کے معنی، علامات قیامت، دجال کے خوارق و عادات، مرزا صاحب کی تحریفیں، مرزا صاحب کا دعوی رسالت، الہام کے اقسام وغیرہ عناوین کے تحت قادیانی فتنہ سے متعلق اہم اور تفصیلی باتیں ہیں اور ان کا دندان شکن جواب اس میں دیا ہے جو واقعی قابل مطالعہ ہے۔

**الکلام المرقوع فیما یتعلق بالحدیث الموضوع :** ۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بڑی کارآمد ہے، بایں وجہ کہ اس میں فن حدیث اور اصول حدیث کے مسائل پر بحث کی گئی ہے اور نہایت متین اور پر اعتماد زبان میں لکھی گئی ہے، یہ ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی، ''انوار احمد'' ۱۲۲۳ھ میں لکھی گئی، اس کا موضوع میلاد و فضائل، درود و آداب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اس کتاب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، درود و سلام کے قواعد اور صحابہ کرامؓ کے آداب اور ضروری مسائل ہیں، اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے لئے مولانا کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی تقریظ کے یہ الفاظ کافی ہیں:

''اس کتاب کے ہر ہر مسئلہ کی تحقیق محققانہ حقانی میں تائید ربانی پائی گئی کہ اس (کتاب) کا ایک ایک جملہ اور فقرہ امداد مذہب اور مشرب اہل حق کی کر رہا ہے اور حق کی طرف بلاتا ہے۔(۱۱)

**افادۃ الافہام فی ازالۃ الاوہام:** اس کا موضوع ردِّ قادیانیت ہے، یہ کتاب ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی، مولانا نے مرزا غلام احمد قادیانی کی کتاب ازالۃ الاوہام کا مکمل رد اس کتاب سے کیا ہے، مولانا نے نہایت تحقیق سے سنجیدہ پیرائے میں جوابات دئے ہیں، اس ضمن میں کئی ضروری دینی مسائل کی تحقیق کے علاوہ تاریخی حالات بھی لکھے ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے قادیانی مذہب کے مقاصد سے پوری آگاہی ہو جاتی ہے، قادیانیت کے رد میں یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

**کتاب العقل :** مولانا نے علم کلام و فلسفہ (عقل کی ماہیت پر) کے موضوع پر کتاب العقل رقم کی، جو ۱۳۲۳ھ کو زیور طبع سے آراستہ ہوئی، اس کتاب میں عقل کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے اور یہ کہ دینی امور میں عقل کا کس حد تک دخل ہے، مولانا نے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ دین جس عقل کے مطابق ہے وہ معمولی عقل نہیں ہے بلکہ وہ مہذب عقل ہے، اس کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسانی عقل چاہے کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو وہ بہر حال غلطی کر سکتی ہے، مولانا نے اس کتاب میں علم، عقل، دل، نفس، وجود، بصارت، قوت، کشش زمین، ہوا کا دباؤ، سمندر کا مد و جزر، بارش اور بخارات حرکت زمین وغیرہ عنوانات پر بحث کرتے ہوئے ہر جگہ عقل انسانی کو عاجز اور محتاج ثابت کیا ہے۔

**حقیقۃ الفقہ :** یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے اس کا موضوع فقہ اور تدوین فقہ ہے، حصہ اول میں مولانا نے فقہ کی حقیقت، اصول فقہ، ناسخ و منسوخ، اختلافات احادیث، محدث اور مجتہد کے فرائض منصبی اور ان کی کوششوں پر روشنی ڈالی ہے، مولانا کی کتاب ''حقیقۃ الفقہ (حصہ دوم) میں

یادِ رفتگاں

فقہ حنفی کی تدوین، شہرت ومقبولیت اور اجماع کے مدلل انداز کا ذکر ہے، اس میں مولانا نے فقہ کو مخالف حدیث کہنے والوں کو مکمل طور پر تشفی بخش جواب دیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ فن حدیث پر مولانا کی نظر کس قدر گہری تھی، اس کتاب سے ثابت کیا گیا ہے کہ فقہ کے سوا کسی بھی کتاب میں کل احادیث کا خلاصہ موجود نہیں ہے اور فقہ حنفیہ سے کوئی حدیث خارج نہیں ہے۔

**مقاصد الاسلام:** یہ کتاب گیارہ حصوں پر مشتمل ہے، جس کا موضوع تمدن اسلام، حدیث، تاریخ، سیر اور تصوف وغیرہ ہے، ان تمام گیارہ حصوں میں تمدن، ولایت، تخلیق انسانی، تصوف وطریقت، جزا وسزا، جنت ودوزخ، قیامت، جبر وقدر، معجزات اور ان کی ضرورت، اتباع صحابۂ کرامؓ جیسے موضوعات پر مولانا نے مفصل بحث فرمائی ہے، اس سلسلے میں مولانا نے قرآنی آیات کے ترجمے بھی اردو زبان میں کئے ہیں، ترجمے کی زبان آسان اور عام فہم ہے، یہ مولانا کی زبان اردو سے بھرپور دلچسپی کا واضح ثبوت ہے۔

**رسالہ وحدت الوجود:** اس کا موضوع تصوف وطریقت کے مضامین ہیں، اس میں مسئلہ وحدت الوجود کو عقلی دلائل کے ساتھ آسان انداز میں سمجھایا گیا ہے۔

**مسئلۃ الربوا :** اس کتاب کا موضوع بنک انٹرسٹ ہے، جس پر مولانا نے قرآن وحدیث کی روشنی میں بھرپور روشنی ڈالی ہے، جو اس بارے میں شاہراہ ہدایت ہے۔

**رسالہ خلق افعال:** اس کا موضوع اللہ کی فاعلیت ہے، اس رسالہ میں مولانا کا اسلوب فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔

**انوار التجید :** مولانا نے یہ کتاب فارسی زبان میں لکھا ہے، جس کا موضوع لم کی فضیلت اور توحید ہے، اس کتاب میں مولانا نے توحید کے مسائل کو نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح مولانا کے دو قلمی نسخے کتب خانہ جامعہ نظامیہ میں محفوظ ہیں جو عربی زبان میں لکھے ہوئے ہیں، ایک انتخاب صحاح ہے، جس کا موضوع تزکیہ نفس ہے اور دوسرا انتخاب فتوحات مکیہ ہے جس کا موضوع تصوف ہے۔

غرض مولانا نے سنجیدہ علمی اور تمدنی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور اردو زبان کو ان تمام مسائل کے لئے وسیلہ اظہار بنایا ہے، ان کی تحریروں میں نثر کی تمام خصوصیات کے ساتھ ایک اہم خصوصیت مقصدیت بھی ہے، مولانا کی نثر میں اظہار کی سادگی، ایجاز واطناب، واضحیت و قطعیت، مقصدیت اور متانت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، کہیں کہیں طنز وظرافت کی جلوہ نمائی بھی ہے، ان کی تحریروں کے مطالعے سے مذہبی معلومات کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے دلچسپی بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان کی نثر موضوع اور مواد کے اعتبار سے علمی وادبی نثر ہے، ان کی اردو تصانیف اپنی خوبیوں کے باعث اردو کے بہترین ادب پارے کہلائی جاسکتی ہیں جن کی اہمیت ہر دور میں مسلمہ رہے گی۔ حضرت انوارؒ کا وصال جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ کو ہوا۔ (۱۲)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساسؔ
ایس اے، ای آر پی، مجلکہ تعلیمات
حیدرآباد، تلنگانہ سرکار 9705853523

# نظم ''فرزندِ جامعہ عثمانیہ'' کا شاعر سکندر علی وجؔد

ولادت: ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء وفات: ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء

سرزمین دکن ازمنہ قدیم ہی سے شعرا و ادبا کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین سے بے شمار صاحبان علم و فن نے اپنی اپنی لیاقتوں و صلاحیتوں کی شمعیں روشن کرتے ہوئے زمانے کی تاریکیوں کو مٹانے کی سعی پیہم کرتے رہے ہیں، چناں چہ اورنگ آباد دکن سے جن شعرائے کرام نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے؛ ان میں ولؔی اور سراؔج کے بعد میر سکندر علی وجؔد کا نام درخشاں ستارے کی مانند منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے۔ اس خصوص میں وجؔد کہتے ہیں۔

دو سو برس میں وجؔد، سراؔج و ولؔی کے بعد
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم

اورنگ آباد سے کوئی ۸۰ کلومیٹر کی دوری پر واقع ضلع اورنگ آباد کا ایک پس ماندہ تعلقہ جو ابتدائی انگریزی عہد میں فوجی چھاونی تھا؛ ویجاپور کے نام سے مشہور رہا۔ اسی مقام پر عبدالغفور عرف گبرو پٹیل کی چوتھی اولاد وجؔد نے ۲۲ رجنوری ۱۹۱۴ کو آنکھیں کھولیں۔ اس ضمن میں یوسف ناظم لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ دو سال کے اندر ہی جنگ عظیم چھڑ گئی؛ وہ زمانہ تھا ہی شاید بڑے واقعات کا۔ ویجاپور میں جس کا اصلی نام بیضا پورہ اور ریلوے اسٹیشن کا نام روٹے گاؤں ہے؛ اردو کے ایک بڑے شاعر کا پیدا ہونا اتنا ہی اہم واقعہ ہے جتنا جنگ عظیم کا ہونا؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے بڑے شاعر، ادیب اور محقق چھوٹے شہروں بلکہ دیہات میں جنم لینا زیادہ پسند کرتے تھے۔''
(یادِ وجؔد، ص ۵۸)

وجؔد کا خاندانی نام میر سکندر علی رکھا گیا، چھٹی جماعت تک ویجاپور میں تعلیم پائی، ہفتم اورنگ آباد سے، ہشتم اور نہم کی تعلیم شہر جالنہ سے حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں اورنگ آباد سے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا پھر عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد سے ۱۹۳۳ء میں انٹر کا امتحان کامیاب کرتے ہی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا رخ کیا اور ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے درجہ اول سے کامیاب ہوئے۔ ایم۔ اے سال اول میں داخلہ لیا ہی تھا کہ حیدرآباد سیول سروس کے لیے منتخب ہوئے اس طرح پوسٹ گریجویشن کی تکمیل نہ کر سکے۔

وجؔد نے شاعری کی ابتدا ۱۹۳۰ء میں اس وقت کی تھی جب وہ نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے؛ ابتدا میں فلکی تخلص اختیار کیا تھا؛ لیکن بعد میں اپنے استاذ عبدالرب کوکبؔ کے کہنے پر وجؔد تخلص رکھ لیا۔ وجؔد نے جس زمانے میں شعر گوئی کی ابتدا کی وہ عہد ہماری تہذیبی، ثقافتی اور ادبی تاریخ کا نشاۃ الثانیہ کہلاتا تھا۔ وجؔد جامعہ عثمانیہ کے ایسے ہونہار سپوت تھے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں شاعری میں نہ صرف بذات خود خوب نام کمایا بلکہ دکن کو سارے ہندوستان میں مینار نور کی حیثیت دے دی؛ جس کی بابت ڈاکٹر طیب انصاری اپنے مضمون ''وجد: خوش جمال شاعر'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''جامعہ عثمانیہ کے قیام نے ریاست حیدرآباد دکن میں علم کو عام کیا اور ادب و تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جامعہ عثمانیہ کے علمی ماحول میں نوجوانوں نے اپنے میں ایک طرح کی خود اعتمادی محسوس کی۔ رومی ٹوپی کا پھندا، ہوا میں لہراتا ہوا اور کچھ گردن اکڑی ہوئی سی۔ جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ جب گھر سے نکلتے تو محلے والے فخر سے انھیں دیکھتے اور سڑک سے گزرتے تو راہ رو تعجب سے ان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتے، دیکھیے! وہ عثمانین ہیں' بی۔ اے کیا ہے، ایم۔ اے ہیں وغیرہ۔'' (یادِ وجد، ص ۲۰۸)

سکندر علی وجؔد ایک ہمہ جہت شخصیت، انسانیت کا پیکر اور آدمیت کی مثال تھے۔ اردو دنیا انھیں ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے

جانتی ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ وجدؔ حیدرآباد دکن کے وہ مایہ ناز شاعر گزرے ہیں کہ جنھیں خطۂ دکن کے لیے ''ملک الشعرا'' کہا جانا نامناسب نہیں؛ کیوں کہ انھوں نے شاعری کو نئی جہت دی، نیا اسلوب اور نئی تکنیک عطا کی، ان کے اشعار دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتے ہیں؛ ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ زندگی کے تجربات کو ایک مدت تک اپنے دل میں پرورش کرتے ہیں؛ پھر ایک مدت تک اس جذبے کے اظہار کی راہ ہموار کرتے ہیں؛ حتیٰ ایں کہ منفرد اسلوب کے لیے کوشاں رہتے ہیں، جب آمد کی کیفیت مکمل طور پر طاری ہوجاتی ہے تو شعر گوئی کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ تب ان کے قلم سے ایسے شعر برآمد ہوتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔

یہاں اس بات کا اعتراف بے جا نہ ہوگا کہ وجد نے اپنے افکار بلیغ کو اپنی تخلیقات میں جمع کردیا ہے، جن کے مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ واقعی شاعری، خون جگر کی متقاضی ہوتی ہے۔ وجدؔ کے کلام کے مطالعے کے بعد یہ بات شہود میں آتی ہے کہ شاعر اپنے افکار کو اپنے خون جگر سے رنگین کرتا ہے اور جب وہ افکار عالیہ خامہ و قرطاس کے وسیلے سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں تو فضائے شعر و سخن انگبیں ہوجاتی ہے۔

وجدؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''لہو ترنگ'' عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد سے اپریل ۱۹۴۴ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا، جس میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا منتخب کلام شامل ہے۔ نظم ''فرزند جامعہ عثمانیہ'' بھی اُسی انتخاب سے اقتباس ہے۔ نظم ''فرزند جامعہ عثمانیہ'' کے متعلق غلام دستگیر قریشی اپنے مضمون ''وجد کی کچھ یادیں'' میں لکھتے ہیں:

''اس نظم کے بعد وجدؔ راتوں رات مشہور اور بے حد مقبول ہوگئے۔ وائس چانسلر مسٹر میکنزی نے ان کو بے حد قریب کرلیا۔''

(یادِ وجد، ص ۷۳)

غلام دستگیر قریشی کے اس اقتباس کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وجدؔ کے ابتدائی کلام میں کس درجے جاذبیت اور کشش موجود ہے۔ بہرحال نظم ''فرزند جامعہ عثمانیہ'' میں جملہ انیس اشعار ہیں اور بحر ہزج مثمن سالم یعنی مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کی تکرار سے تشکیل پانے والی بحر میں یہ نظم لکھی گئی ہے، جس کے ابتدائی سات اشعار اس طرح ہیں:۔

علم دارِ اُخوت، اُلفتِ خواب گراں کب تک
یوں ہی گھائل رہے گا توسنِ طبعِ رواں کب تک
ہوائے یاس، گُل کردے نہ شمعِ آرزو تیری
کہیں تاریک ہوجائے نہ بزمِ جستجو تیری
یہ بے ہوشی کہاں تک با خبر ہو اپنی ہستی سے
نکل جا، ایک ہی جنبش میں دامِ وہم پستی سے
ذرا کھول آنکھ، صورت، تک رہا ہے گلستاں تیری
تجھے کیا ہوگیا، کھلتی نہیں ہے کیوں زباں تیری
ہزاروں زاغ دعوے کر رہے ہیں خوش بیانی کے
دکھانے ہیں تجھے بُلبل کرشمے گُل فشانی کے
بہار آئی ہے جو کھویا ہے اُس کی جستجو کرلے
یہی موسم ہے قبضے میں جہانِ رنگ و بو کرلے

ترا سازِ عمل خاموش ہے مضراب پیدا کر
یہ رازِ زندگی ہے سیرتِ سیماب پیدا کر

وجدؔ نے اس نظم کے ہر شعر کو بعد آنے والے شعر سے مربوط کرتے ہوئے ان میں قوافی اور ردیف کا خوب خیال رکھا ہے۔ غزل کے پیرائے میں نظم کہنے کا یہ اسلوب وجدؔ نے شاید اقبالؔ سے سیکھا ہوگا تب ہی تو وجدؔ کی شاعری علامہ اقبالؔ کی شاعری کا عکس معلوم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ نظم پڑھتے جایئے، گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ اقبالؔ کا کلام تو نہیں ہے۔ اقبالؔ نے بھی اپنی ایک نظم میں یہی انداز اپنایا ہے؛ جس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

تو رازِ کُن فکاں ہے، اپنی آنکھوں سے عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا، خدا کا ترجماں ہوجا
ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا
یہ ہندی، وہ خُراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہوجا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہوجا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اسی طرح وجدؔ کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:۔

جہاں کے حادثوں سے کھیلتا جا مُسکراتا جا
زمانے کے مصائب جھیلتا جا مُسکراتا جا

یہی دن ہیں شریکِ زُمرۂ اہلِ وفا ہوجا
تلاشِ گوہرِ مقصد میں دریا آشنا ہوجا

اقبالؔ اپنے صاحب زادے جاوید اقبال کے نام لکھے خط میں جو نصیحت اپنے فرزند ارجمند کو فرمائی ہے، وہ اس طرح ہے۔۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

وجدؔ کی نصیحت فرزندان جامعہ عثمانیہ کے نام اس طرح ملتی ہے۔۔

ترا سازِ عمل خاموش ہے مضراب پیدا کر
یہ رازِ زندگی ہے سیرتِ سیماب پیدا کر

OOO

یادِ رفتگاں

یہ بھی دیکھیے :۔

ضرورت ہوتو سر بھی نذرِ ناموسِ وطن کردے
جزاک اللہ تازہ قصۂ دار و رسن کردے

وجؔد نے ''فرزندِ جامعہ عثمانیہ'' میں فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس نظم کے ایک ایک شعر میں شوکت لفظی کے ساتھ نصیحت کاملہ کی جو جھلکیاں ملتی ہیں؛ وہ اظہر من الشمس ہیں۔

وجؔد کی شاعری محض لفظوں کی شاعری نہیں بلکہ جذبات کی شاعری ہے؛ ان کی شاعری تصنع سے عاری اور ریا سے مبریٰ قرار دی جاسکتی ہے۔ خالص جذبات کے موتی ہیں کہ گردونِ فکر سے ٹپک پڑتے ہیں؛ ایک رودِ مسلسل ہے کہ ذہن اور دل کو سیراب کرتی ہے، ایک قوسِ قزح ہے کہ جو روح پر طلوع ہوجاتی ہے۔

وجؔد کو گفتگو کا قرینہ اور اظہارِ مافی الضمیر کا سلیقہ خوب آتا ہے۔ جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں کہ سننے والا یہ کہے بغیر نہیں رہتا کہ میں نے جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ کرتے چلیں:۔

تعاقب میں ترے بجلی بھی تھک کر چُور ہوجائے
ترے قبضے میں آکر وقت بھی مجبور ہوجائے
مزہ جب ہے تری کوشش بنادے پھول خاروں کو
ترے سنگیں ارادے کاہ کردیں کوہساروں کو
کہیں مجبورِ ناکامی بھی سچّی لاگ ہوتی ہے
دلِ فولاد پگھلادے یہ ایسی آگ ہوتی ہے
تو مشرق زاد ہے، غافل نہ ہو مشرق کے بیڑے سے
سفینے کو بچا طوفانِ مغرب کے تھپیڑے سے
یہ ہے دامِ اجَل تقلید کے گرداب سے بچنا
جو ڈوبا پھر نہ اُبھرا دیکھ اِس سیلاب سے بچنا
بہاریں ہی بہاریں ساتھ لائے خُرمی تیری
نظامِ دہر برہم کر کے رکھ دے برہمی تیری
حقیقت بیں، خذف ریزوں میں گوہر ڈھونڈ لیتے ہیں
جو کچھ پاتے نہیں وہ عیب اکثر ڈھونڈ لیتے ہیں

مذکورہ اشعار کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ شرافت وجؔد کی مزاج کا خاصا تھا، بھید بھاؤ سے مبریٰ، اونچ نیچ سے ماوریٰ، حرص وطمع سے خالی اور بغض وعناد سے تہی ان کی زندگی پیغام محبت کے سوا کچھ نہ تھی، جس کی کیفیت ہمیں اوپر بیان کیے گئے اشعار میں محسوس ہوتی ہے۔ بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ یہ حضرات جب ایک بات کہہ دیا کرتے ہیں تو صدیوں تک بھلائی نہیں جاسکتی۔ نظم کے مزید اشعار اس طرح ہیں۔

کہیں عِزّت نہیں ہے عیب جوئی کرنے والوں کی
وہ آگے بڑھ نہیں سکتے قسم ہے با کمالوں کی
بہادر زخم اپنے غیر کو دکھلا نہیں سکتا
لبوں پر دم ہو پر شکوہ زباں پر لا نہیں سکتا

جہاں کے حادثوں سے کھیلتا جا مُسکراتا جا
زمانے کے مصائب جھیلتا جا مُسکراتا جا
یہی دن ہیں شریکِ زُمرۂ اہلِ وفا ہوجا
تلاشِ گوہرِ مقصد میں دریا آشنا ہوجا
ضرورت ہو تو سر بھی نذرِ ناموسِ وطن کردے
جزاک اللہ تازہ قصۂ دار و رسن کردے

یہ دَور مغربی تہذیب کی نقالی کا دور ہے اور شاید وجدؔ کے دور میں بھی مغربیت، مشرقیت پر غالب رہی ہوگی۔ وجدؔ اگر ان امور دل انگیز کی جانب انگشت نمائی نہ بھی فرماتے تو دیکھنے والے تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ وجدؔ کی اس ثریا آثار عجز و انکساری کے باوصف فرزند جامعہ عثمانیہ کی تعریف و توصیف بہر حال ایک خوش بختی ہے اور کون ہے جو اس کلیدِ خُلد یعنی خوش بختی کے طرۂ امتیاز سے اپنی کج کلاہی کو زینت نہ بخشے۔

انسانی فطرت ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے اور یہ خواہش انسان کو بام عروج تک پہنچائے بغیر نہیں رہتی۔ چنانچہ انسان خوب صورت چیزوں کو مزید خوب صورت اور طرح طرح سے آراستہ کر کے اس کے حسن کو مزید دوبالا کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ شعرائے کرام بالخصوص سکندر علی وجدؔ بھی اپنے کلام کو صرف شعری وزن اور دیگر ضروریات شعری سے ہی آراستہ نہیں کرتے بلکہ لفظی اور معنوی خوبیوں کے ذریعے شعر میں حسن پیدا کردینے کا زبردست ملکہ رکھتے تھے۔ اشعار میں حسن اور جدت پیدا کرنے کے اس طریقے کو ہم اصطلاح میں صنائع و بدائع کا نام دیتے ہیں۔ صنائع جمع ہے ''صنعت'' کی اور بدائع ''بدیع'' سے مشتق ہے۔ اس طرح لفظی خوبیوں کو ''صنائع'' اور معنوی خوبیوں کو ''بدائع'' کہتے ہیں۔ وجدؔ کے کلام کو اگر ہم ان صنعتوں پر پرکھتے ہیں تو نتائج خوش آئند نکلتے ہیں جیسے وجدؔ کی اس نظم میں تجنیس زائد کی مثال ملتی ہے۔ صنعت تجنیس زائد سے مراد کلام میں ایسے دو لفظ لانا جن میں ایک حرف کا فرق ہو، خواہ یہ حرف شروع میں ہو یا آخر میں یا درمیان میں۔ جیسے ناسخؔ کا شعر ہے: ؎

یوں نہ باتیں چبا چبا کے کرو
مہرباں بات ہے نبات نہیں

اس شعر میں بات اور نبات میں ایک حرف زیادہ ہے۔ سکندر علی وجدؔ کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے: ؎

کہیں مجبورِ ناکامی بھی نچی لاگ ہوتی ہے
دلِ فولاد پگھلادے یہ ایسی آگ ہوتی ہے

مذکورہ شعر میں لفظ ''لاگ'' کے تین حرف اور ''آگ'' کے دو حرف ہیں۔ اس طرح ''لاگ'' کا ایک حرف زائد ہے۔

وجدؔ کی اس نظم کے دو ایک شعر میں ''صنعت ذو قافیتین'' بھی ملتے ہیں؛ جیسے اس شعر میں ''صنعت ذو قافیتین'' پائی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ''فرزند جامعہ عثمانیہ'' کے اس شعر میں بھی وہی صنعت ملتی ہے۔ شعر دیکھیے: ؎

بہاریں ہی بہاریں ساتھ لائے محرمی تیری
نظامِ دہر برہم کر کے رکھ دے برہمی تیری

ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے: ؎

تو مشرق زاد ہے، غافل نہ ہو مشرق کے بیڑے سے
سفینے کو بچا طوفانِ مغرب کے تھپیڑے سے

یادرفتگاں

اوپر بیان کیے گئے اشعار میں سے پہلے شعر میں ''خرّمی'' اور ''برہمی'' قافیے اور ''تیری'' ردیف ہے، لیکن ان قافیوں کے علاوہ ''لائے'' اور ''رکھ دے'' مزید دو قافیے ملتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ''بیڑے'' اور ''تھپیڑے'' قافیے اور ''سے'' ردیف ہے، لیکن ان قافیوں سے پہلے ''مشرق کے'' اور ''مغرب کے'' مزید قافیے ملتے ہیں۔ نظم ''فرزند جامعہ عثمانیہ'' میں صنعت سیاقتہ الاعداد بھی ملتی ہے۔ جیسے وجؔد کہتے ہیں: ؎

یہ بے ہوشی کہاں تک باخبر ہو اپنی ہستی سے
نکل جا، ایک ہی جنبش میں دامِ وہمِ پستی سے

ایک اور شعر اس طرح بھی ملتا ہے: ؎

ہزاروں زاغ دعوے کررہے ہیں خوش بیانی کے
دِکھانے ہیں تجھے بُلبل کرشمے گُل فشانی کے

مذکورہ اشعار کے پہلے شعر میں ''ایک ہی جنبش'' اور دوسرے شعر میں ''ہزاروں زاغ'' صنعت سیاقتہ الاعداد کی مثالیں ہیں۔

وجؔد کی اس نظم میں ''صنعت اشتقاق'' کی مثال اس طرح ملتی ہے: ؎

ذرا کُھول آنکھ، صورت، تک رہا ہے گلستاں تیری
تجھے کیا ہوگیا، کُھلتی نہیں ہے کیوں زباں تیری

اشتقاق لفظ مشتق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں، ایک مصدر سے کئی الفاظ بنانا جیسے مذکورہ شعر میں ''کُھلنا'' سے ''کھول'' اور ''کُھلتی'' بنایا گیا ہے۔ یہی صنعت اشتقاق ہے۔

''فرزندِ جامعہ عثمانیہ'' میں صنائع لفظی کی مذکورہ صنعتوں کے علاوہ صنائع معنوی کی مثالیں بھی ملتی ہیں؛ جیسے وجؔد کی اس نظم میں صنعت تضاد کی مثالیں دیگر صنعتوں کی بہ نسبت زیادہ ملتی ہیں۔ مثالیں دیکھیے: ؎

مزہ جب ہے تری کوشش بنادے پھول، خاروں کو
ترے سنگیں ارادے کاہ کردیں کوہساروں کو

(پھول۔خار) متضاد ہیں

تو مشرق زاد ہے، غافل نہ ہو مشرق کے بیڑے سے
سفینے کو بچا طوفانِ مغرب کے تھپیڑے سے

(مشرق۔مغرب) متضاد ہیں

حقیقت بیں، خذف ریزوں میں گوہر ڈھونڈ لیتے ہیں
جو کچھ پاتے نہیں وہ عیب اکثر ڈھونڈ لیتے ہیں

(خذف۔گوہر) متضاد ہیں

بہادر زخم اپنے غیر کو دکھلا نہیں سکتا
لبوں پر دم ہو پر شکوہ زباں پر لا نہیں سکتا

(اپنے۔غیر) متضاد ہیں

وجدؔ کی نظم ''فرزند جامعہ عثمانیہ'' میں صنعت مبالغہ بھی ملتا ہے؛ اس کی تین قسمیں ہیں۔ تبلیغ، اغراق اور غلو۔ تبلیغ سے مراد ایسا مبالغہ جو عقل اور عادت دونوں کے قریب ہو۔ مثلاً کسی مجمع میں آدمیوں کی کثیر تعداد کو ظاہر کرنے کے لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ وہاں ''ہزاروں کا مجمع'' تھا۔ خواہ گنتی کے اعتبار سے چاہے وہاں ایک ہزار آدمی بھی نہ ہوں۔ اس خصوص میں وجدؔ کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

ہزاروں زاغ دعوے کررہے ہیں خوش بیانی کے
دِکھانے ہیں تجھے بلبل کرشمے گُل فشانی کے

''اغراق'' سے مراد ایسا مبالغہ جس کو عقل تو قبول کرتی ہو، لیکن عادتاً ایسا نہ ہو۔ جیسے وجدؔ کا یہ شعر دیکھیے: ؎

تعاقب میں ترے بجلی بھی تھک کر چُور ہوجائے
ترے قبضے میں آکر وقت بھی مجبور ہوجائے

اس شعر میں ''بجلی'' کا تعاقب کرنا عقلاً تو قبول ہے، لیکن عادتاً نہیں اور قبضے میں آکر وقت مجبور ہونا بھی عقلاً تسلیم کیا جاسکتا ہے، لیکن عادتاً یہ ہو نہیں سکتا، اس کے علاوہ وجدؔ نے ''بجلی'' اور ''وقت'' کو انسان کا استعارہ قرار دیا ہے۔ ایک اور شعر اس طرح ملتا ہے۔ ؎

کہیں مجبورِ ناکامی بھی سچّی لاگ ہوتی ہے
دلِ فولاد پگھلادے یہ ایسی آگ ہوتی ہے

''دلِ فولاد'' کا پگھلنا بھی عقلاً قبول ہے عادتاً ہرگز نہیں۔ اس طرح یہ شعر بھی دیکھیے: ؎

مزہ جب ہے تری کوشش بنادے پھول خاروں کو
ترے سنگیں ارادے کاہ کردیں کوہساروں کو

پھولوں کا خار ہونا اور سنگین ارادوں کا کوہسار ہونا بھی عقلاً درست ہے، عادتاً نہیں۔

مذکورہ مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وجدؔ کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی نظم نگاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وجدؔ کی نظموں کے عنوانات، موضوعات، نکات اور علامات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا شاعرانہ حسن لطیف جمالیات پسند ہے، بلکہ وہ جمالیات میں بھی کچھ روحانی اور اخلاقی مضمرات تلاشتے ہیں۔ وجدؔ کے اس غیر معمولی اسلوب اور اظہار کی یہ خوبی انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز گردانتی ہے۔

بالآخر راقم الحروف یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرزمین دکن بالخصوص فرزندان جامعہ عثمانیہ نے یوں تو بے شمار شعرا، ادبا، نقاد، محقق اور ادب کے والہ وشیدا بلکہ پرستار پیدا کیے ہیں لیکن وجدؔ ایک ایسا شاعر گزرا ہے جو نہ صرف حیدرآباد کے لیے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے لیے باعث صد افتخار ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد انوارالدین
صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے نسواں، گوکلنڈہ، حیدرآباد۔ موبائل: 9032458868

# دکنی ادب کے فروغ میں اساتذۂ جامعہ عثمانیہ کا حصہ

عثمانیہ یونیورسٹی کو ہندوستان کی جامعات میں اس لیے امتیاز وافتخار حاصل ہے کہ یہ ایک دیسی زبان کی پہلی یونیورسٹی ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو بنایا گیا۔ تمام علوم وفنون جیسے سائنس، انجینئرنگ، ٹکنالوجی، میڈیسن وغیرہ کے لیے بھی ذریعہ تعلیم اردو ہی رکھا گیا۔ اس دانش گاہ کو قائم کرنے کا خیال والیٔ سلطنت حیدرآباد آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خاں کے ذہن میں آیا تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں انہوں نے 1917ء میں ایک فرمان جاری کیا تھا۔ چناں چہ 1918ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس جامعہ میں درس وتدریس کا آغاز 1919ء میں ہوا اور اسی سال انٹرمیڈیٹ اور 1921ء سے گریجویشن اور 1923ء سے پوسٹ گرایجویشن کی تعلیم شروع ہوئی۔

ایم اے (اردو) کے دوسرے سال میں طلبہ اور اساتذہ میں تحقیق اور تدقیق کے ذوق کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں امتحان کا طریقۂ کار یہ رکھا گیا کہ ایک پرچے کے متبادل کے طور پر کسی موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا جائے یا پھر پرچہ ہی تحریر کیا جائے۔ پوسٹ گرایجویشن میں سال دوم کے امتحان کا انعقاد سب سے پہلے 1925ء میں ہوا لیکن شعبۂ اردو میں مقالہ لکھنے کا آغاز 9 سال بعد یعنی 1934ء میں ہوا۔

شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی بیاچس میں محی الدین قادری زورؔ اور عبدالقادر سروری آنے والے زمانے میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہر دکنیات اساتذہ اور صدر وشعبہ ثابت ہوئے۔ ایم اے اردو سال آخر میں مقالہ تحریر کرنے کا آغاز جیسا کہ چند سطور پہلے تحریر کیا گیا ہے۔ 1934ء میں ہوا اور یہ سلسلہ 1976ء تک جاری رہا لیکن درمیان میں 15 سال (1950-1964) تک اسے ختم کر دیا گیا۔ تاہم ان 25 برسوں میں بھی شعبہ اردو میں دکنی ادب کی تحقیق سے متعلق اتنے اہم اور گراں قدر مقالے قلمبند کیے گئے تھے کہ ملک کی دیگر جامعات میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ایم اے کے چند مقالوں کے عناوین ملاحظہ ہوں۔

ہاشمی بیجاپوری (محمد احسان اللہ) مطبوعہ وجیہہ الدین وجدی (محمد بن عمر) مطبوعہ سراج اورنگ آبادی (سید حامد علی خاں) نصرتی کی قصیدہ نگاری (محمد قیوم شریف) بیجاپور کا ایک شاعر (قمر ساحری) دکنی اور پنجابی کا تقابلی مطالعہ (ملک ساغر حسین) روضۃ الاطہار (میر سعادت علی رضوی) خواصی شخصیت اور فن (محمد علی اثر) مطبوعہ۔

جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں سب سے پہلے ایم اے کرنے کا افتخار سید محی الدین قادری زور کو حاصل ہے۔ جنہوں نے 1927ء میں ایم اے (اردو) کا امتحان کامیاب کیا تھا۔ زور صاحب ماہر دکنیات ولسانیات ہونے کے پہلو بہ پہلو ایک کثیر الجہات مصنف بھی تھے۔ تنقید، تدوین، سوانح، صحافت، غالبیات اور اقبالیات ان کے خصوصی موضوعات تھے۔ ایم اے کرنے کے فوراً بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وظیفے پر یورپ روانہ ہوئے اور لندن یونیورسٹی سے ''اردو زبان کا آغاز وارتقاء'' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ 1931ء کو حیدرآباد لوٹنے کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں بہ حیثیت ریڈر ان کا تقرر عمل میں آیا۔

دکنی ادب کی تحقیق سے متعلق ڈاکٹر زور کی پہلی کتاب ''اردو شہ پارے'' ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کی تحقیق کے سلسلے میں انہیں لندن، پیرس، اڈنبرا، کیمبرج اور آکسفورڈ میں قیام کر کے وہاں کے کتب خانوں میں محفوظ دکنی مخطوطات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ 1929ء کی چھٹیوں کے دوران جب زور صاحب حیدرآباد آئے تو یہاں کے دکنی مخطوطات کا یورپ کے قلمی نسخوں سے تقابل کر کے ہر مخطوطے کے مصنف کے حالات زندگی اور دیگر تفصیلات کے ساتھ اس شاہ کار تصنیف کو منظر عام پر لایا۔ ''اردو شہ پارے'' کے علاوہ دکنی ادب کی تحقیق وتنقید اور تدوین سے متعلق ان کی دیگر تصنیفات وتالیفات میں ''کلیات محمد قلی قطب شاہ'' پانچ جلدوں پر مشتمل ''تذکرہ اردو مخطوطات'' اور ''دکنی ادب کی تاریخ'' کے نام غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

مضامین

کلیات محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر زور کا دوسرا اہم تحقیقی و تدوینی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب 1940ء میں سلسلہ یوسفیہ حیدرآباد کے تحت مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے خاص اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی۔ محمد قلی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور مملکت گولکنڈہ کا پانچواں حکمران تھا۔ زور صاحب نے کلیات پر 365 صفحات پر مشتمل ایک بسیط اور پرمغز مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کو مرتب کرتے وقت سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ تین مخطوطات اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے مملوکہ ایک قلمی نسخے کو پیش نظر رکھا اور تین سال کی محنت شاقہ اور جان فشانی کے بعد اسے منظر عام پر لایا۔ محمد قلی قطب شاہ کے حالات و سوانح پوری تفصیل سے قلمبند کرتے ہوئے انہوں نے شاعر کے کلام کی تنقید و تحسین بھی کی ہے۔ محمد قلی کے کلام کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے اس عہد کی تہذیب و ثقافت کا بھی نہایت شرح وبسط سے جائزہ لیا ہے۔ مقدمے کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ محمد قلی کی شاعری کا مزاج اور ماحول خالص ہندوستانی ہے۔ زور صاحب نے اپنے چند ساتھیوں کے تعاون سے ادارہ ادبیات اردو کے نام سے ایک کتب خانے کا قیام عمل میں لایا تھا جس میں نہایت قیمتی اور نادر و نایاب قلمی نسخوں کو جمع کرنے کے سلسلے میں انہوں نے ایک تحریک چلائی تھی اور اس سلسلے میں مخطوطات کے تحفظ کی بھی انہوں نے حتی المقدور کوشش کی۔

ڈاکٹر زور نے ادارے میں موجود تمام قلمی نسخوں کی فہرستیں پانچ جلدوں میں شائع کیں۔ جس کی پہلی جلد 1943ء میں اور پھر اس کے بعد دوسری 1951ء تیسری 1957ء چوتھی 1958ء پانچویں اور آخری جلد 1959ء میں شائع ہوئی۔ بادی النظر میں تذکرہ مخطوطات کی یہ پانچ جلدیں محض فہرستیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ مفصل و ضاحتی فہرستیں ہیں جن میں مخطوطے کے عنوان کے علاوہ مصنف کا نام، موضوع، اس کے دیگر نسخوں کی تفصیل، مخطوطے کا سائز، کاغذ اور روشنائی کی عمر، کتابت کی تاریخ و مقام، کاتب کا نام وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان امور کی اہمیت و افادیت مسلّم ہے۔ ڈاکٹر زور کو یورپ کے مخطوطات کی چھان بین کے دوران مخطوط شناسی کے فن اور اس کے لوازم پر کافی عبور حاصل ہو چکا تھا اس لیے انہیں کلیات محمد قلی قطب شاہ کی تدوین کے سلسلے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی لیکن مخطوط شناسی کے سلسلے میں جو مشکل مرحلے درپیش ہوئے ہیں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اس تذکرہ مخطوطات کی ترتیب کے سلسلے میں مؤلف کو جو زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جو وقت صرف ہوا ہے اس کا اندازہ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنہیں قلمی نسخوں سے کام لینے کا تجربہ ہوا ہو۔'' (ڈاکٹر زور، تذکرہ مخطوطات (جلد اول)، حیدرآباد، 1943ء، ص 13)۔

دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر زور کی ایک مختصر کتاب ہے جو 1960ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں دکنی ادب کی تاریخ کو درج ذیل پانچ ابواب میں منقسم کر کے زور صاحب نے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

پہلا باب بہمنی دور، دوسرا باب عادل شاہی دور۔ تیسرا باب قطب شاہی دور۔ چوتھا باب مغل عہد۔ پانچواں باب دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر۔

**پروفیسر عبدالقادر سروری** نے 1929ء میں ایم اے اردو کا امتحان امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا تھا۔ اسی کے ساتھ قانون (LLB) کی ڈگری بھی اعلا درجے کے ساتھ کامیاب کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے لسانیات میں ریسرچ ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ ان کا پہلا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں لکچرر کی حیثیت سے ہوا تھا اور پھر بہت جلد وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے سات سال (1942-1848ء) تک میسور یونیورسٹی کے مہاراجہ کالج میں صدر شعبۂ اردو فارسی اور عربی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور پھر اسی سال جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ 1952ء میں پروفیسر اور صدر شعبۂ بنے اور 1961ء میں سبکدوش ہو گئے۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں اردو فارسی کے پروفیسر صدر شعبۂ اور ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لینگویجس کی حیثیت سے کارگزار مقرر ہوئے۔ 1971ء میں ڈاکٹر زور کی طرح ان کا بھی کشمیر ہی میں انتقال ہو گیا۔

مضامین

دکینات ولسانیات کے علاوہ افسانہ نگاری سروری صاحب کے تخصیصی موضوعات تھے جہاں تک دکنی ادب کی تحقیق وتنقید اور تدوین کا تعلق ہے، پروفیسر سروری کی درج ذیل کتابیں اہمیت کی حامل ہیں:

فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ ۔ اردو کی ادبی تاریخ ۔ شاہ سراج اور ان کی شاعری ۔ سراج سخن اور اردو مثنوی کا ارتقاء۔ کلیات سراج ۔مثنوی پھول بن ۔قصۂ بے نظیر اور مراۃ الاسرار۔

پروفیسر سروری نے اردو میں سب سے پہلے مخطوطات کی وضاحتی فہرست 1929ء میں ''فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ'' کے نام سے شائع کی۔ اردو میں قلمی کتابوں کی توضیحی فہرست کا ذکر کرتے ہوئے سروری صاحب لکھتے ہیں۔

''مخطوطات کی تفصیلی فہرستیں یورپ مے متشرقین مثلاً بلوم ہارٹ ۔ ایتھے ۔ ڈاکٹر اسپرنگر وغیرہ نے یوری زبانوں میں لکھی ہیں۔ مولوی شمس اللہ قادری نے بھی بلوم ہارٹ کی اردو مخطوطات (انڈیا آفس لائبریری) کا محض ترجمہ کی صورت میں پیش کیا تھا لیکن اردو زبان میں اردو مخطوطات کی فہرست لکھنے کی کوشش شاید کسی نے اب تک نہیں کی ۔ اسی لیے اس فہرست کو گویا اس قسم کی کوششوں کا آغاز سمجھنا چاہئے ۔'' (پروفیسر سروری مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد (1929ء) (پیش لفظ)۔

سروری صاحب کی مؤلفہ اردو کی ادبی تاریخ 1950ء میں شائع ہوئی۔ یہ تاریخ ادب اردو، مروجہ نوعیت کی تاریخ نہیں ہے۔ اس میں مختلف ادوار کے رجحانات اور محرکات پر زور دیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہی ادب کے مزاج کو سمجھنے اور ادیبوں کی ذہنی ساخت سے آگہی بہم پہنچاتے ہیں۔ اس ادبی تاریخ میں پروفیسر سروری نے عنوانات بھی نئے انداز میں قائم کئے ہیں جیسے قدیم ہندوستان عظیم ہندوستان ۔ نئی لہر۔ تہذیبی لین دین وغیرہ۔

شاہ سراج اورنگ آبادی پر پروفیسر سروری کا تحقیقی وتنقیدی کام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس عظیم المرتبت صوفی شاعر کے کلیات کو مرتب کیا بلکہ مثنوی بوستان خیال، ان کے کلام کا انتخاب اور شاہ سراج اور ان کی شاعری پر تین کتابیں شائع کیں۔

''اردو مثنوی کا آغاز وارتقاء'' میں سروری صاحب نے دکنی مثنویوں کا کما حقہ جائزہ لیا۔ صنعتی بیجاپوری کی مثنوی قصۂ بے نظیر کو انہوں نے غیر معمولی انہماک اور تحقیقی دروں بینی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ابن نشاطی گولکنڈہ وی کی شاہ کار مثنوی پھولبن کو پروفیسر سروری نے کئی نسخوں سے تقابل کے بعد سب سے پہلے منظر عام پر لایا۔ یہ مثنوی سلسلہ یوسفیہ کی جانب سے 1940ء میں چھپی۔

**پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا** کی ابتدائی تعلیم دلی میں اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے دور میں سر راس مسعود کی دعوت پر حیدرآباد آئے اور یہیں آباد ہوگئے۔ پہلے محکمہ پولیس میں ملازم ہوئے اور بعد کو نظام کالج میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ نظام کالج سے وابستگی کے دوران دکنی ادب سے متعلق ان کے متعدد مضامین مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔

آغا حیدر حسین کی تین کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں سے ایک ''پس پردہ'' ہے جو دلی کی بیگماتی اور ٹکسالی زبان سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتاب ''ندرت زبان'' (1996ء) میں اور تیسری کتاب ''حیدرآباد کی سیر'' (1997ء)۔ آخر الذکر دو کتابوں کو ان کی صاحبزادی مہر النساء اور داماد معظم حسین نے 1997ء میں ان کی وفات کے بعد آغا حیدر حسین ریسرچ سنٹر سے شائع کیا۔

حیدرآباد کی سیر میں دکن کے چند مرثیہ گو پر صرف ایک مقالہ ہے جس میں غواصی، طالع، ظہور، فائز کے مرثیوں کے چند اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

''ندرت زبان'' میں تمام مضامین دکنی ادب سے متعلق ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں۔ نوسرہار (اشرف)۔ ظفر نامۂ عشق، وسیلہ نجات، سلطان عبداللہ کے گیت، علی نامہ (نصرتی)، پھولبن (ابن نشاطی) وغیرہ۔ پروفیسر آغا کا ایک اہم تحقیقی کام دکنی لغت اور تذکرۂ دکنی مخطوطات ہے۔

اس نامکمل اور غیر مطبوعہ کام کی اہمیت کے پیش نظر پروفیسر مغنی تبسم نے اسے مکمل کر کے آغا حیدر حسن ریسرچ سنٹر سے 2002ء میں شائع کر دیا۔

**مولوی عبدالحق** کی ابتدائی تعلیم میرٹھ کے قصبہ ہاپوڑ میں اور اعلیٰ تعلیم علیگڑھ میں ہوئی۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد پہنچے۔ جہاں 1896ء میں ان کو اولین ملازمت مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس کی حیثیت سے ملی۔ 1900ء سے انہوں نے رسالہ افسر کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دینی شروع کیں۔ 1911ء میں مہتمم تعلیمات کے عہدہ پر اورنگ آباد میں ان کا تقرر ہوا تو اسی سال اورنگ آباد چلے گئے۔ 1917ء میں جامعہ عثمانیہ کے تحت دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو ناظم دارالترجمہ کے عہدے پر ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کچھ عرصے تک وہ انجمن ترقی اردو کے چوتھے سکریٹری کی حیثیت سے اورنگ آباد میں کام انجام دیتے رہے۔ جب انجمن کا دفتر علیگڑھ منتقل ہوا تو انہوں نے اس دفتر کو اورنگ آباد منتقل کروادیا۔ 1923ء میں اورنگ آباد کالج کا قیام عمل میں آیا۔ تب انہیں اس کالج کا صدر بنایا گیا۔ جب وہ حیدرآباد واپس ہوئے تو 1931ء میں انہیں شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کا پہلا صدر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی ساری زندگی اردو زبان کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ جہاں تک مولوی صاحب کے دکنی ادب کی تحقیقی وتنقید سے متعلق کارناموں کا تعلق ہے انہوں نے خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب نثری رسالے ''معراج العاشقین'' کو 1343ھ میں شائع کیا تھا۔ مزید برآں وجہی کی نثری تصنیف سب رس اور نصرتی کی مثنوی گلشن عشق کو انہوں نے عالمانہ مقدموں کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ عبدالحق صاحب کے دکنی شعراء کے بارے میں لکھے ہوئے کئی مقالے قدیم اردو کے نام سے چھپے۔ انہوں نے ایک مختصر سی کتاب ''اردو کی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام'' 1933ء میں شائع کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ان کی ''نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور'' کے عنوان سے ایک کتاب 1944ء میں شائع ہوئی۔ جس میں اس باکمال شاعر کی غیر مطبوعہ غزلیں، رباعیاں، قصدے اور قطعات کے علاوہ مثنوی ''تاریخ اسکندری'' بھی شامل ہے۔

**پروفیسر مسعود حسین خاں** دکنی اردو کے غیر دکنی محققین میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ 1962ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں وہ بہ حیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ بن کر آئے اسی زمانے میں انہیں ادبی تحقیق اور اردو کے قدیم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے:

''علمی اعتبار سے عثمانیہ یونیورسٹی میں میرا چھ سالہ قیام (1962-1968ء) خود میرے لیے بارآور رہا۔'' (ورود مسعود، ص 200)

قدیم اردو سے متعلق مسعود صاحب کے اہم کارناموں میں پرت نامہ، ابراہیم نامہ، دکنی اردو کی لغت (بہ اشتراک ڈاکٹر غلام عمر خاں) اور محمد قلی قطب شاہ (مونوگراف) کے نام اہم ہیں۔

مثنوی پرت نامہ کا منصف فیروز بیدری، ثم گولکنڈوی ہے۔ یہ مثنوی جامعہ عثمانیہ سے مسعود صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے مجلّے ''قدیم اردو'' کی پہلی جلد (1965ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس مجلّے کی ترتیب میں جو اصول پیش نظر رکھے گئے ہیں ان پر روشنی ڈالتے ہوئے مسعود حسین خان نے لکھا ہے:

''اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ''قدیم اردو'' کے تلفظات کا صحت کے ساتھ تعین کیا جا سکے۔ اس غرض سے اعراب اور دیگر تشریحات سے مدد لی گئی ہے۔ تلاش وجستجو کے بعد جو مقامات حل نہیں ہو سکے ان پر سوالیہ نشان قائم کر دیا گیا ہے۔'' (قدیم اردو، جلد اول، ص: ب)

ابراہیم نامہ دکنی ادب کی تحقیق وتدوین کے سلسلے میں مسعود صاحب کی ایک اہم کاوش ہے جس کا مصنف عبدل دہلوی ثم بیجاپوری ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے بیجاپور کے چھٹے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو (1580-1611) کی مدح سرائی کی ہے۔ ابراہیم نامہ نہ صرف دبستان بیجاپور کی ایک اہم مثنوی ہے بلکہ عادل شاہی دور کا پہلا ادبی نقش بھی ہے۔ نیز یہ کتاب لسانی اور ادبی اعتبار سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جسے مسعود حسین خان نے پہلی بار 1969ء میں مجلّہ قدیم اردو کی تیسری جلد کی طور پر میں شائع کیا۔

مسعود صاحب نے ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی فرمائش پر محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور شاعری پر 112 صفحات پر مشتمل کا یک مونوگراف

مضامین

1989ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب کی دوسری اشاعت 1998ء میں عمل میں آئی۔ دوسرا ایڈیشن ہی میرے پیش نظر ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے سرورق پر محمد قلی قطب شاہ کے بجائے اس کے بھتیجے داماد اور گولکنڈے کے چھٹے حکمراں سلطان محمد قطب شاہ کی تصویر چھپی ہے۔

**پروفیسر رفیعہ سلطانہ** کو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کی پہلی خاتون پی ایچ۔ڈی، صدر شعبہ اردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ جامعہ عثمانیہ سے انہوں نے 1946ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ویمنس کالج میں ان کا تقرر 1947ء میں بہ حیثیت اردو لکچرر عمل میں آیا۔ پروفیسر رفیعہ نے اپنا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ''اردو نثر کا آغاز وارتقاء'' کے موضوع پر پروفیسر عبدالقادر سروری کی رہنمائی میں تحریر کر کے 1954ء میں ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کی سند ملنے کے بعد ان کا تبادلہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں ہوا۔ اس کے بعد انہیں ریڈر کے عہدے پر ترقی ملی اور پھر 1968ء سے 1979ء تک وہ پروفیسر اور صدر شعبہ رہیں۔ 1982ء میں وہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس بنیں، دو سال تک اس عہدے پر فائز رہیں اور پھر 1985ء میں وظیفے پر سبکدوش ہوئیں۔

دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی کتاب ''کلمۃ الحقائق'' (1961ء)۔ ''اردو نثر کا آغاز وارتقاء'' (1962ء) اور ''دکنی نثر پارے'' (1967ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کتاب برہان الدین جانم کا مختصر نثری رسالہ ہے جس کے مصنف کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ثانی الذکر کتاب میں رفیعہ سلطانہ نے بڑی محنت اور کدوکاوش سے اردو نثر کی تاریخ مرتب کی۔

آخر الذکر کتاب جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے دکنی اردو نثر کے بعض انتخابات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو پروفیسر مسعود حسین خاں اور شری ڈی راماچ راؤ کی تحریک پر قلمبند کیا گیا تھا۔ دکنی نثر پاروں پر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ایک عالمانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں مختلف دلائل سے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ''دکنی'' قدیم اردو ہی کی ایک شکل ہے۔

**ڈاکٹر حفیظ قتیل** شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے پی ایچ۔ڈی تھے جنہوں نے ''اردو غزل کا ارتقاء'' کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے جامعہ عثمانیہ سے 1954ء میں پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ 1947ء میں بحیثیت لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی (ورنگل) ان کا تقرر عمل میں آیا۔ 1949ء کو آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد سے جامعہ عثمانیہ سے متعلق مختلف کالجوں میں خدمات انجام دیتے ہوئے 1979ء میں پوسٹ گرائجویٹ کالج بشیر باغ سے بہ حیثیت ریڈر یو وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ دکنی تحقیق سے متعلق قتیل صاحب کی تین کتابیں اہم ہیں: ''دیوان ہاشمی'' ''معراج العاشقین کا مصنف'' اور ''میراں جی خدانما''۔ ہاشمی بیجاپوری کی رنگینیوں پر مشتمل دیوان کو قتیل صاحب نے 1961ء میں مرتب کر کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے قدیم دکنی زبان کے محاورے زنانی زیوارت، آرائش وزیبائش کی بھی تفصیل سے نشاندہی کی ہے۔ دیوان ہاشمی کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہاشمی کا دیوان دکن کی مستورات کی زبان محاروں اور کہاوتوں کا گنجینہ ہے۔'' (دیوان ہاشمی، ص:145)

''ڈاکٹر قتیل کی معرکتہ الآرا کتاب معراج العاشقین کا مصنف ہے۔ اس کتاب کی اشاعت نے اردو تحقیق کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ معراج العاشقین کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے 1363ھ میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے 1957ء میں مرتب کر کے اس کتاب کو دہلی سے شائع کیا۔ لیکن حفیظ قتیل صاحب نے متن تنقید اور تحقیق دروں بینی سے پہلی بار اس بات کا انکشاف کیا کہ یہ کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز کی نہیں بلکہ اس کا مصنف مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہے جس کا تعلق خانوادہ امین الدین علی اعلیٰ بیجاپوری سے ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی دکنی ادب سے متعلق ایک اور کتاب میراں جی خدانما ہے جو 1961ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس مختصر کتاب میں حضرت میراں جی خدانما حیدرآبادی کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مزید برآں ان کی نظم ونثر کے انتخابات بھی دیئے گئے ہیں۔

**ڈاکٹر زینت ساجدہ** کو جامعہ عثمانیہ کی خاتون اساتذہ میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ 1947ء میں

مضامین

ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال ویمنس کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ایک عرصہ دراز تک وہ نظام کالج اور پی جی کالج بشیر باغ میں بھی خدمات انجام دیتی رہیں۔ انہوں نے اشرف بیابانی کی مثنوی نوسر ہار کو اپنی پی ایچ۔ڈی کی تحقیق کا موضوع بنایا اور حفیظ قتیل کی نگرانی میں جامعہ عثمانیہ میں مقالہ داخل کر کے 1973ء میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ 1983ء سے 1984ء تک جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ رہیں اور اسی عہدے سے وظیفے پر سبکدوش ہوئیں۔ دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے کے علاوہ دو یونا گری میں لکھی ہوئی قاضی محمود بحری کی مثنوی من لگن اور علی عادل شاہ ثانی شاہی کا کلیات قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے ایک پر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔ مقدمہ میں ڈاکٹر زینت ساجدہ نے نہ صرف شاہی کی حیات اور شاعری کا جائزہ لیا ہے بلکہ اس کے کلام کی لسانی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

**پروفیسر غلام عمر خاں** نے ماہر اقبالیات اور ماہر دکنیات کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ انہوں نے 1946ء میں اردو سے ایم اے کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں ''اقبال کا تصور انسان کامل'' کے موضوع پر مقالہ لکھا کہ 1955ء میں پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ 1958ء میں بہ حیثیت اردو لکچرر نظام کالج میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔

1965ء میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں ریڈر مقرر ہوئے۔ 1978ء میں پروفیسر و صدر شعبہ اردو جائزہ حاصل کیا اور 1983ء میں وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ جہاں تک دکنی اردو سے متعلق عمر خان صاحب کی تصانیف کا تعلق ہے ان کی مُرتبہ پانچ کتابیں قابل ذکر ہیں: (۱) مینا ستونتی' (۲) لیلی مجنوں' (۳) دکنی اردو کی لغت (بہ اشتراک پروفیسر مسعود حسین خاں)' (۴) مجلّہ تحقیقات اردو' (۵) قدیم دکنی شاعری۔ انتخاب۔

مضامین

میناست ونتی ملک الشعراء غواصی کی پہلی مثنوی ہے جو مجلّہ ''قدیم اردو'' کی پہلی جلد میں 1965ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ بعد میں اس کے دو ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔ اس کتاب کی تدوین کے دوران پروفیسر صاحب نے مینا ستونتی کے نو مخطوطات کو پیش نظر رکھا۔ عمر خاں صاحب نے اس کتاب میں ایک مفصل اور عالمانہ مقدمہ تحریر کیا جس میں تدوین کے طریقہ کار کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ دکنی اردو کی یہ پہلی مثنوی ہے جسے جدید تحقیقی وصولوں کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ لیلیٰ مجنوں عاجز کی مثنوی ہے جو پہلی بار 1967ء میں قدیم اردو کی دوسری جلد میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو بھی بعد میں علاحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ لیلی مجنوں غلام عمر خاں صاحب کی دوسری اہم تحقیقی کاوش ہے۔ اس کتاب میں بھی انہوں نے شاعر کے حالات زندگی اور اس کی شاعرانہ خوبیوں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اپنے مرتبہ متون میں کافی محنت اور تحقیقی دروں بینی کا ثبوت دیا ہے۔ پروفیسر غلام عمر خاں کا ایک اہم کارنامہ دکنی اردو کی شراکتی لغت ہے جس کی تفصیل مسعود حسین خاں کے تذکرے میں بیان کی گئی ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران غلام عمر خان نے کئی اہم کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے بین الکلیاتی اردو فسٹیول (جشن اردو) کا احیاء کیا اور ساتھ ہی ساتھ اردو ریسرچ اسکالرس اسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا تھا جس کے صدر پروفیسر غلام عمر خان تھے۔ اس اسوسی ایشن کے تحت ہر ماہ تحقیقی مقالے پڑھے جاتے اور ان مقالوں کو ''مجلّہ تحقیقات اردو'' کے نام سے شائع کیا جاتا۔ مجلّہ تحقیقات اردو کے مدیر پروفیسر عمر خان اور نائب مدیران میں ڈاکٹر محمود قادری اور ڈاکٹر محمد علی اثر شامل تھے۔

**مولوی اکبرالدین صدیقی** نے ایم اے کا امتحان جامعہ عثمانیہ سے 1942ء میں کامیاب کیا۔ 1955ء میں سٹی کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا۔ بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف ملحقہ کالجوں سے وابستہ رہنے کے بعد آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے خدمات انجام دیتے ہوئے 1947ء میں وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔

دکنی ادب سے متعلق ان کی تحقیقی کتابوں میں مثنوی چندر بدن و مہیار' کلمۃ الحقائق' کشف ابوجود' ابلیس نامہ' ارشاد نامہ' پھولبن' انتخاب محمد قلی قطب شاہ' بھجتے چراغ اور مخطوطات ادارہ ادبیات اردو بہ اشتراک ڈاکٹر محمد علی اثر (جلد ششم) کے نام قابل ذکر ہیں۔ صدیقی صاحب نے

مقیمی کی مثنوی چندر بدن ومہیار کو 1965ء میں مرتب کے کے اس پر ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا تھا۔ کلیۃ الحقائق' برہان الدین جانم کا نثری رسالہ ہے جسے صدیقی صاحب نے 1961ء میں مرتب کر کے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔

کشف الوجود والکون کے ایک صوفی شاعر حضرت داول کا ایک قدیم رسالہ ہے۔ اسے مرتب کر کے صدیقی صاحب نے 1965ء میں قدیم اردو کی پہلی جلد میں شائع کیا تھا۔ ابلیس نامہ علاء الدین فقیر کی مثنوی ہے جسے اکبر الدین صدیقی نے سید مبارز الدین رفعت کے اشتراک سے مرتب کے کے قدیم اردو کی دوسری جلد (1967ء) میں شائع کیا تھا۔ اکبر الدین صدیقی کا ایک قابل قدر تحقیقی کارنامہ برہان الدین جانم کی مثنوی ''ارشاد نامہ'' کی تدوین ہے جو 1971ء میں منظر عام پر آئی۔ ابن نشاطی کی مثنوی پھولبن کو مرتب کر کے اکبر الدین صدیقی صاحب نے 1970ء میں ترقی اردو بورڈ کی جانب سے شائع کیا۔ اس کتاب میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے پروفیسر سروری کے مقدمے پر اکبر الدین صدیقی کا نام تحریر ہو گیا۔ اکبر الدین صدیقی نے ڈاکٹر محمد علی اثر کے اشتراک سے ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کی چھٹی جلد مرتب کر کے 1983ء میں شائع کی۔ موصوف کے دکنی ادب سے متعلق مضامین کا ایک مجموعہ ''بجھتے چراغ'' کے عنوان سے 1975ء میں منظر عام پر آیا۔

**پروفیسر ابوالفیصل سید محمود قادری فیضی** نے جامعہ عثمانیہ سے 1953ء میں ایم اے اردو کا امتحان کامیاب کیا۔ ان کے بعد 1953ء سے 1956ء تک اردو کے جزوقتی لکچرر کی حیثیت سے انہوں نے آرٹس اینڈ سائنس کالج سکندرآباد میں خدمات انجام دیں۔ 1960ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ 1978ء میں ریڈر اور پھر کچھ عرصے کے بعد پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ملازمت کے دوران انہوں نے پروفیسر غلام عمر خان کی نگرانی میں وجدی کی مثنوی ''مخزن عشق'' کو مرتب کر کے پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ اس مثنوی کو انہوں نے 1986ء میں شائع کیا تھا اس کے علاوہ ڈاکٹر عطاء اللہ خان نے ان کی وفات کے بعد 2006ء میں دکنی ادب سے متعلق ان کے مضامین کا مجموعہ مقالات محمود قادری کے عنوان سے منظر عام پر لایا۔

**پروفیسر محمد ہاشم علی** نے جامعہ عثمانیہ سے فارسی اور اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1959ء سے 1961ء گلبرگہ کالج میں اردو اور فارسی کے لکچرر کے عہدے پر فائز رہے۔ دوران ملازمت ''شاہ صدرالدین کی حیات اور اردو خدمات'' کے موضوع پر انہوں نے مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1979ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں بہ حیثیت ریڈر ان کا تقرر عمل میں آیا جہاں انہوں نے تقریباً پانچ سال تک خدمات انجام دینے کے بعد انہوں نے 1981ء میں میسور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور 1991ء میں وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر ہاشم علی کی دو کتابیں ''میراں جی خدانما'' اور ''مغز مرغوب و چہار شہادت'' ان کے قیام حیدرآباد کے دوران شائع ہوئیں۔

**پروفیسر سیدہ جعفر** نے دکنی اردو کی خاتون محققین میں سب سے زیادہ تحقیقی و تنقیدی خدمات انجام دی ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے 1954ء میں اردو سے ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے 1959ء میں ''اردو مضمون کا ارتقاء'' کے موضوع پر پروفیسر سروری کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری اصل کی۔ 1958ء میں نظام کالج میں بہ حیثیت اردو لکچرران کا تقرر ہوا۔ 1965ء میں ریڈر 1983ء میں پروفیسر اور 1984ء میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئیں۔ دکنی اور دکنیات کے موضوع پر ان کی کتابیں ''من سمجھاون'' (1964ء)۔ ''دکنی رباعیاں'' (1966ء)۔ ''سکھ انجن'' (1968ء)۔ ''ڈاکٹر زور'' (1984ء)۔ ''دکنی نثر کا انتخاب'' (1983ء)۔ ''یوسف زلیخا'' (1983ء)۔ ''کلیات محمد قلی قطب شاہ'' (1985ء)۔ ''جنت سنگھار'' (1997ء)۔ ''دکنی ادب میں قصیدے کی روایت''۔ ''انتخاب محمد قلی''۔ ''دکنی ادب کا مطالعہ'' بہ اشتراک ڈاکٹر افضل اقبال (1990ء)۔ ''ماہ پیکر'' (1986ء)۔ ''گلدستہ'' اور ''تاریخ ادب اردو'' (1700ء تک' بہ اشتراک گیان چند (پانچ جلدوں میں) (1998ء) ''نوسر ہار'' (2016ء) اور حال ہی میں ''دکنی لغت'' شائع ہوئیں۔

مضامین

دکنی ادب کی خاتون محققوں میں پروفیسر سیدہ جعفر سب سے زیادہ فعال رہیں۔ انہوں نے دکنی ادب کی تحقیق۔ تدوینی تحقیق۔ غیر تدوینی تحقیق۔ تنقیدی تحقیق' ترتیب و تدوین متن غرض ہر شعبہ نقد و تحقیق میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

**پروفیسر حبیب ضیاء** نے عثمانیہ یونیورسٹی سے 1959ء میں ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی نگرانی میں ''مہاراجہ کشن پرشاد کی ادبی خدمات کے موضوع پر مقالہ لکھ کر 1966ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1967ء میں اورینٹل اردو کالج میں ان کا تقرر لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ 1984ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ ایک عرصے تک ویمنس کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد وہیں سے وظیفے پر سبکدوش ہوئیں۔ دکنی ادب سے متعلق ''دکنی زبان کی قواعد'' کے نام سے ان کی ایک کتاب 1964ء میں شائع ہوئی۔ حال ہی میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔

**پروفیسر اشرف رفیع** نے 1965ء میں ایم اے کیا اور نظم ''طباطبائی کی حیات اور کارناموں کا جائزہ'' کے موضوع پر 1969ء میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ 1977ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ 1984ء ریڈر اور 1989ء میں انہیں پروفیسر بننے کا موقع ملا۔ دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی ایک کتاب ''دکنی مثنویوں کا انتخاب'' (1990ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ دکنی ادب کے موضوع پر ان کے متعدد مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

**پروفیسر محمد علی اثر** نے 1974ء میں اردو سے ایم اے کیا تھا۔ 1980ء میں انہوں نے ''دکنی غزل کی نشو ونما' کے موضوع پر پروفیسر غلام عمر خان کی نگرانی میں مقالہ تحریر کر کے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ ایم اے سال آخر (1974ء) میں ڈاکٹر اثر نے ایک پرچے کے متبادل کے طور پر ملک الشعراء ''غواصی شخصیت اور فن'' کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو 1977ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کی اب تک 62 تصنیفات و تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن دکنی اردو کنیات 1982ء میں پہلا ایڈیشن 1987ء میں دوسرا پاکستانی ایڈیشن ''تذکرہ اردو مخطوطات'' بہ اشتراک محمد اکبرالدین صدیقی'' (چھٹی جلد) (1982ء)۔ ''دبستان گولکنڈہ ادب اور کلچر'' (1982ء)۔ ان کتابوں کے علاوہ پروفیسر اثر کی دکنی ادب کی تحقیق و تنقید اور ترتیب و تدوین سے متعلق متعدد کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ جن میں ''دکنی غزل کی نشو نما'' (1986ء)۔ ''دکنی شاعری تحقیق و تنقید'' (1978ء)۔ ''جنوب کا شعر و ادب'' (1995ء)۔ ''دکنی غزلوں کا انتخاب'' (1996) ''محی الدین قادری زور'' (1991ء)۔ ''نگارشات اثر'' مرتبہ محمد عطاءاللہ (2004ء)۔ ''تذکرہ اردو مخطوطات'' جلد اول مرتبہ ڈاکٹر زور ترمیم و اضافہ محمد علی اثر (1996ء) ''نوادرات تحقیق'' (1996ء) تحقیقی نقوش'' (1993ء)۔ ''دیوان عبداللہ قطب شاہ'' بہ اشتراک ڈاکٹر عطا اللہ خاں (2000ء)۔ دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' بہ اشراک ڈاکٹر جمال شریف (2004ء)۔ ''دکنی کی تین مثنویاں'' (1987ء)۔ ''مقالات اثر'' (2000ء)۔ ''تحقیقات اثر'' (2000ء) ''تحقیقات و تاثرات'' (2008ء)۔ ''انکشافات'' (2009ء)۔ ''تذکرہ اردو مخطوطات (جلد دوم سوم) مرتبہ اکثر زور ترمیم و اضافہ محمد علی اثر'' (2006ء) ''کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات (جلد اول دوم) (2012ء)۔ ''مدحت رسول اکرمؐ دکنی غزلوں کے حوالے سے'' (2009ء)۔ ''غواصی کا نایاب کلام'' (2002ء)۔ ''مثنوی پند دلبند'' (2009ء)۔ ''مثنوی نجات نامہ'' (2009ء)۔ قدیم اردو غزل تنقید و انتخاب'' (2011ء)۔ ''عادل شاہی دور میں اردو غزل'' (2012ء)۔ ''انتخاب داؤد اور نگ آبادی'' (2012ء)۔ ''دکنی ادب کی تحقیق'' (2012ء)۔ ''انبساط فکر'' (2014ء)۔ ''قطب شاہی دور میں اردو غزل'' (2015ء)۔ ''اشراق ادبیات دکن'' (2016ء)۔

**پروفیسر افضل اقبال** نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ''مدراس میں اردو ادب کی نشو نما کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں 1978ء میں پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ 1984ء میں وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں بہ حیثیت لکچرر وابستہ

مضامین

ہوئے۔ 1994ء میں ریڈر اور 2000ء میں پروفیسر بنائے گئے۔ دکنی ادب سے متعلق ان کی پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے علاوہ دیگر تصانیف میں پروفیسر سیدہ جعفر کے اشتراک سے ''دکنی ادب کا مطالعہ'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے غلام غوث کے اشتراک سے مدراس کے قاضی عبیداللہ لائبریری اور امانتی کتب خانے کے اردو مخطوطات کی فہرستیں بھی مرتب کیں۔

**ڈاکٹر عقیل ہاشمی** نے 1975ء میں ایم اے کرنے نے بعد ''عشرتی کی مثنوی'' دیپک پتنگ'' کی تدوین کے موضوع پر پروفیسر غلام عمر خاں کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر جامعہ عثمانیہ سے پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ 1982ء میں بہ حیثیت لکچرر نظام کالج میں ان کا تقرر ہوا۔ 1987ء میں ریڈر کے عہدے پر ترقی ملی۔ عقیل ہاشمی نے دکنیات کے موضوع پر ''دکنی مناقت کا انتخاب'' 2000ء میں شائع کی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی ادارت میں فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک کتاب ''دکنی ادب'' کے نام سے شائع ہوئی۔

**پروفیسر فاطمہ پروین** نے 1975ء میں ایم اے کامیاب کیا تھا۔ ایم فل کے لیے انہوں نے سترھویں صدی کی دکنی شاعری کے موضوع پر (1979ء) میں مقالہ لکھ کر پروفیسر رفیعہ سلطانہ کی نگرانی میں سند حاصل کی۔ پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ انہوں نے 1989ء میں پروفیسر غلام عمر خان کی نگرانی میں ''غواصی کا تنقیدی مطالعہ'' لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ یہ دونوں مقالے ہنوز غیر مطبوعہ میں 1990ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ 1997ء میں ریڈر اور 2005ء میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی ملی۔ دکنی ادب سے متعلق ان کے چند مضامین فاصلاتی تعلیم سے متعلق کتاب ''دکنی ادب'' میں شائع ہوئے۔

**پروفیسر مجید بیدار** نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند 1976ء میں حاصل کی۔ اس کے بعد پونا یونیورسٹی سے ''دکنی تذکرے'' کے عنوان سے پی ایچ۔ ڈی کی سنہ 1985ء میں ڈاکٹر شیخ امانت کی نگرانی میں حاصل کی۔ چند برسوں تک اورنگ آباد کے مختلف کالجوں میں بہ حیثیت اردو لکچرر کام کرنے کے بعد 1997ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر بنائے گئے۔ 2005ء میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی ملی۔ دکنی تحقیق سے متعلق ان کی تصانیف میں پی ایچ۔ ڈی کے مقالے (1985ء) دکنی تذکرے کے علاوہ ''دکنی نثر پر ایک نظر'' (2007ء) اور ''اردو شہ پارے'' کا مرحمہ ایڈیشن مرتبہ ڈاکٹر زور نظر ثانی مجید بیدار اہمیت رکھتے ہیں۔

**پروفیسر عطیہ سلطانہ** نے جامعہ عثمانیہ سے 1979ء میں ایم اے کرنے کے بعد ایم فل کی سند حاصل کی۔ 1987ء پروفیسر یوسف سرمت کی نگرانی میں میں ''دیوان غواصی کی تدوین'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ انہوں نے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں 1990ء میں لکچرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس کے بعد ویمنس کالج پر ان کا تبادلہ ہوا۔ بعد ازاں وہ 1999ء میں ریڈر اور 2007ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ دکنی ادب کے سلسلے میں پروفیسر عطیہ کی دو کتابیں ''غواصی کا تغزل'' (2006ء) اور ''لسانی مطالعے'' (2006ء) شائع ہوئیں۔

**پروفیسر یوسف سرمست** بنیادی طور پر فکشن کے نقاد ہیں لیکن 2003ء میں انہوں نے دکنی ادب کی مختصر تاریخ کے نام سے ایک کتاب مرتب وشائع کی۔

**ڈاکٹر صبیحہ نسرین** نے اردو سے ایم اے حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی سے کامیاب کرنے کے بعد ایم فل کی ڈگری ''حضور اکرمؐ سے متعلق دکنی مثنویاں'' کے موضوع پر تمینہ شوکت کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر 1985ء میں حاصل کی۔ پی ایچ۔ ڈی کے لیے انہوں نے ''میراں جی شمس العشاق'' کے موضوع پر ڈاکٹر گیان چندجین کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر حیدرآباد یونیورسٹی سے 1992ء میں ڈگری حاصل کی۔ دکنی ادب کے سلسلے میں انہوں نے شمس العشاق کی مثنوی ''وصیت النور'' (1988ء) میں شائع کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''دکنی نعتوں کا انتخاب'' ''شجر طوبیٰ'' (2003ء) میں ''نور نامہ'' (2004ء) میں اور ''خوش نامہ'' (2007ء) میں شائع کیں۔

☆☆☆

پروفیسر محمد علی اثرؔ، کاشانہ اثر 9/226-4-20، محبوب چوک، حیدرآباد۔ 002 500 (تلنگانہ) موبائل: 9848740484

# حیدرآباد میں اردو ناول کے پچیس سال (۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۰ء)

مضامین

دکن کی سرزمین میں کتھا بنانے والا خمیر ابتداء ہی سے موجود ہے۔کبھی یہ کتھا سب رس کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے اور کبھی سیر کہسار، جام سرشار، چنچل نار کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔آج سے سو برس قبل متذکرہ ناول دکن ہی میں لکھے گئے تھے۔اور آج کی تاریخ میں اردو ادب میں لکھا جانے والا آخری ناول (جو شائع ہو چکا ہے) ''یہ راستے'' حیدرآباد ہی کی ٹیالی سرزمین پر تخلیق ہوا ہے۔ میں نے اپنی سہولت کی خاطر حیدرآباد میں اردو ناول کی تاریخ کے صرف پچیس برس کا انتخاب کیا ہے۔اس انتخاب کو آپ میری کم علمی کی دلیل بھی قرار دے سکتے ہیں اور میری طالب علمانہ کوشش بھی سمجھ سکتے ہیں۔

ناول کی تعریف کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ ''ناول اپنی وسیع ترین تعریف میں زندگی کا شخصی اور راست اثر ہے۔[۱] علاوہ ازیں ''روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہونے والے واقعات کے مانوس ربط''[۲] کو بھی ناول کا نام دیا گیا ہے۔ استادمحترم پروفیسر سید مجاور حسین رضوی نے ناول کو ''دلچسپ واقعات کا زمانی ومکانی اظہار''[۳] قرار دیا ہے۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''ناول تہذیب کا عکاس نقاد اور پاسبان ہے۔کسی ملک کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا اندازہ وہاں کی شاعری سے ہوتا ہے مگر اس کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔'' [۴]

حیدرآباد میں لکھے جانے والے ناولوں کی تہذیب اور دکن کی روح اپنی زندگی کی حرارت کا احساس دلاتی ہے گذشتہ بیس برس میں حیدرآباد کے ناول نگاروں نے تقریباً پندرہ ناول لکھے' جیلانی بانو نے دو ناول لکھے۔ ''ایوان غزل'' ۱۹۷۶ء میں اور ''بارش سنگ'' ۱۹۸۵ء میں۔ آمنہ ابوالحسن نے سنہ ۱۹۸۰ء اور سنہ ۱۹۹۰ء کے درمیان تین ناول لکھے۔بائی فوکل by focal' مائی نس پلس minus plus' اور یادش بخیر۔رفیعہ منظورالامین نے دو ناول لکھے۔ ''عالم پناہ'' ۱۹۸۳ء اور ''یہ راستے'' ۱۹۹۵ء مظہرالزماں خاں نے آخری داستان گو ۱۹۹۰ء۔اور ہریانہ سے آکر حیدرآباد کو اپنا وطن ثانی بنانے والے گیان سنگھ شاطر نے اپنا سوانحی ناول ''گیان سنگھ شاطر'' ۱۹۹۴ء میں تصنیف کیا۔ گذشتہ بیس برس میں لکھے جانے والے ابتدائی تین ناول یعنی ''ایوان غزل''، ''عالم پناہ'' اور ''بارش سنگ'' حیدرآبادی تہذیب کو موضوع بنا کر لکھے گئے ہیں۔جیلانی بانو نے ''ایوان غزل'' میں زمانے کو ایوان بناتے ہوئے غزل کے بدلتے ہوئے لب ولہجہ اور آہنگ کی کہانی لکھی ہے۔کبھی غزل ایوان ودربار کی زینت تھی' پھر یہ معتوب ہوئی اور پھر زمانے کے سامنے غزل کا وہ روپ آتا ہے جسے جیلانی بانو نے ''کرانتی'' کا نام دیا ہے۔جو انقلابی ہے۔انسان کے کرب کو

سمجھتی ہے۔انسانی رشتہ کو جانتی ہے جو اپنے کامریڈ ساتھیوں کی موت پر ایک آنسو نہیں بہاتی لیکن غزل آنٹی کی انگوٹھی گم ہوجانے پر تڑپ اٹھتی ہے۔کرانتی جو اپنے جیب میں ٹائم بم لیے گھومتی ہے۔یہی غزل کا نیا مضمون ہے۔

ایوان غزل میں جیلانی بانو نے ۱۹۴۷ء سے قبل کے حیدرآباد اور آزادی ہند کے بعد کے حیدرآباد کی داستان قلمبند کی ہے۔تہذیبی مرقعے اس ناول کی روح ہیں جسے جیلانی بانو نے غزل کے تلازمے میں بیان کیا ہے۔ایوان غزل میں رضا کاروں کے نعرے بھی ہیں، پولیس ایکشن بھی ہے، مخدوم کی رومانی بھی ہے، تلنگانہ تحریک بھی ہے۔یہاں راج بہادر گوڑ بھی ہیں، اور زینت آپا بھی ہے۔ایوان غزل ایک مخصوص علاقے کی تہذیبی تاریخ کو موضوع بنا کر لکھا گیا ناول ہے جسے پڑھتے ہوئے نجانے کیوں تحت الشعور میں کرشن چندر کا ناول ''جب کھیت جاگے'' اپنا پرتو دکھاتا ہے۔

جیلانی بانو نے اپنے دوسرے ناول ''بارش سنگ'' میں بھی اسی موضوع کو بیان کیا ہے۔چیکٹ پلی اور نلگنڈہ کے ریڈی خاندانوں کی آویزش اس ناول کے پلاٹ کی تعمیر کرتی ہے۔سلیم اس ناول کا مرکزی کردار ہے اور کہانی نیم تاریخی واقعات کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔جس میں کسانوں کی زندگی اور استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔

رفیعہ منظوالامین کا ناول ''عالم پناہ'' بھی حیدرآباد کی تہذیب کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن یہاں پولیس ایکشن کے بعد جاگیردار طبقہ کے روشن خیالی اور آزاد زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔یہ وہ ماحول ہے جس میں جاگیردار طبقہ خود کو adjust کرتے اور بدلتے ہوئے حالات تبدیل ہوتے ہوئے اقدارِ حیات سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اور یہ طبقہ ناول کے ختم ہوتے ہوئے عوام سے قریب ہوجات ہے۔تب ہی ''عالم پناہ'' وجود میں آتا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کے تینوں ناول حالانکہ جدید لب ولہجہ اور ترقی پسند خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن فن کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے ہیں۔رفیعہ منظورالامین کا دوسرا ناول ''یہ راستے'' حیدرآباد سے دور اوٹی کی برفیلی پہاڑیوں اور چائے کے باغات کی بھینی بھینی خوشبو کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔اس ناول میں تہذیب کے مرقعے نہیں ملتے لیکن حیدرآباد کے متوسط طبقہ اور اوٹی کے اعلیٰ طبقہ کی خاموش کشمکش، زندگی کے نشیب وفراز کا بیان اس ناول میں ملتا ہے۔کاکل حیدرآباد سے تعلق رکھتی ہے۔یہی کردار ناول کا بہترین کردار ہے، جس میں زندگی جینے کی تڑپ ہے۔ماندگی کے وقفہ میں دم لے کر آگے بڑھنے کا عزم ہے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ بھی ہے۔مرد کرداروں میں التمش کا کردار جاندار ہے۔لیکن مسیح کا کردار اپنی انفرادیت کی وجہ سے یادگار بن گیا ہے۔۔ڈورا اور اختر بخت کے کردار ٹائپ کردار ہیں۔

گیان سنگھ شاطر ہریانہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب انھوں نے حیدرآباد ہی کو اپنا وطن بنایا ہے۔انہوں نے اپنی سوانح کو ناول قرار دیا ہے۔گیان سنگھ شاطر میں روایتی ناول کی ہیئت

مضامین

کی تلاش مفقود ہے چونکہ یہ ایک سوانحی ناول ہے اسی لئے ایک کردار اپنی سوانح بچپن سے بیان کرتا ہے۔ ناول کے اقسام یا تکنیک بیان کرتے ہوئے world literature کی جلد دوم میں اس قسم کے ناول کو پکارسک ناول قرار دیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''پکارسک ناول ایک آوارہ گرد کی سوانح ہوتی ہے جو عموماً واحد متکلم میں ہوتی ہے۔۵

اور کانرڈ (conard) لکھتا ہے:

''آپ ناول کے ذریعہ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ زندگی کے کسی بھی گوشہ میں جھانک سکتے ہیں۔ دنیائے فکر کے کسی بھی شعبہ کی چھان بین کر سکتے ہیں لیکن بہ حیثیت مصنف آپ کسی بھی مقصد کا پروپگنڈہ نہیں کر سکتے۔''۶

ان اقتباسات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ گیان سنگھ شاطر، پکارسک ناول ہے اور ناول نگار نے واحد متکلم کے پردہ میں زندگی کے ہر گوشہ میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ہریانہ کی سرزمین، ہشیار پور کے کھیت کھلیان سکھوں کی نشست و برخاست، اُن کا روزمرہ، اُن کی گالی گلوج، اُن کے سیٹھنیاں اُن کے لطیفے، اُن کی جنسی کجروی، اُن کا ذوق امرد پرستی اور اُن کی سطحی حسن و عشق پرستی سبھی کچھ اس ناول میں بیان ہوا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اس ناول کو ''غیر معمولی کتاب'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ غیر معمولی کتاب جسے سوانحی ناول کہا گیا ہے زندگی کی آتشیں بھٹی سے نکلا ہوا انگارا ہے جسے شاطر نے ہاتھ میں لے لیا ہے اور انگلیاں جلا ڈالی ہیں۔''۷

عجیب اتفاق ہے کہ انگارے جب بھی اردو میں بھڑکتے ہیں اپنی تاریخ بناتے ہیں۔ نئی روایت تشکیل دیتے ہیں۔ گیان سنگھ شاطر کا پلاٹ فسانہ آزاد کی طرح کئی ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔ یہاں بھی فسانہ آزاد کی طرح پلاٹ سے زیادہ واقعات اور کردار اہم ہیں۔ اس ناول کے کرداروں کے جم غفیر میں کردار قاری کے سامنے بار بار آتے ہیں۔ شاطر، تاؤجی اور بھائیاجی Bha'yaji شاطر تایا جی کا پرتو ہے۔ بھائیاجی تاؤ جی اور شاطر کے درمیان منفی رجحانات کا مثلث بناتے ہیں۔ شاید یہ پہلا ناول ہے جس میں بھائیاجی یعنی باپ کو منفی کردار یعنی ویلن کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ تایا جی مثالی کردار ہے اور خود شاطر، ہریانہ کا ایک شاطرؔ عورت زدہ کردار ہے جو کبھی اپنے بھائیاجی کی جانب دیکھتا ہے تو کبھی تسکین قلب کے لئے تایاجی کے ارشادات کی تعمیل کرتا ہے۔ تمام تر ناول میں شاطر نے اپنے کردار کو نمایاں کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ زوال پذیر معاشرے میں فرد صرف اپنی ذات کو مرکز بنا کر زندگی کا سفر طے کرنے لگتا ہے۔۸ اور اڈنڈولسن کہتا ہے۔ ''یہ نظریہ ارتقاء کا نتیجہ ہے کہ انسان ہیرو کی بلند سطح سے بے بس جانور کی طرح بن گیا ہے۔۹

شاطرؔ نے جدّت کی جستجو میں خود کو ہیرو کی سطح سے گرادیا ہے۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہہ کتاب اپنی

نوعیت کی منفرد کتاب ہے اور اپنے اندر بے انتہا خوبیاں رکھتی ہے۔ شاطر وسیع تر تناظر میں اپنی بات کہتا ہے اور زندگی کا تقاضہ بھی یہی ہوتا ہے۔۔۔ لیکن ہر وہ بات جو ہمارے مشاہدے سے گزرے ضروری نہیں کہ ہم اُسے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیں اور پھر اُسے Reproduce کرلیں۔ ہم اکیسویں صدی کی چوکھٹ پر کھڑے ہیں۔ تہذیب کی بے مثال ترقی ہمارے دامن کی شوبھا بڑھا رہی ہے، اور اسی تہذیب نے ہم پر چند اصول لاگو کیے ہیں۔ ہمیں بتایا ہے کہ بات کس طرح کی جائے۔ کھانا کس طرح کھایا جائے۔ ضروریات زندگی کی تکمیل کس طرح کی جائے۔ اور یہ تحدیدات اس لیے ہیں کہ ان اعمال کو پردہ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ تحلیل نفسی یا کرداروں کی نفسیات کے نام پر سماج کی گندگی کو بیان کرنے کی اجازت ادب نہیں دیتا۔ گیان سنگھ شاطر کی کتاب پڑھتے ہوئے عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اور اپندر ناتھ اشک کا ناول ''گرتی دیواریں'' بار بار ہمیں اپنے وجود کا ثبوت دینے لگتے ہیں۔ اور گیان سنگھ شاطر کی خوشہ چینی کا ہمیں یقین دلاتے ہیں۔ (مثلاً، شاطر کا باپ یا گرتی دیواریں کا باپ یا عورت کے اعضاء کا تذکرہ۔)

خورشر کہتا ہے کہ ''پلاٹ ذہانت اور یاداشت کا بھی مطالعہ کرتا ہے''[10]۔۔۔ گیان سنگھ شاطر نے اپنی کتاب لکھتے ہوئے ذہانت اور یاداشت (یا پروپگنڈا) کا بہت اچھا استعمال کیا ہے۔ لیکن ناول کا فن بھی اپنے مقصد کا پروپگنڈا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ گیان سنگھ شاطر نے تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنا پروپگنڈا کیا ہے۔ گیان سنگھ شاطر ناول ہے یا نہیں۔ یہ ایک سوال بھی آج ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ سوانح کو جو کہ بچپن سے جوانی تک بیان ہوتی ہے اگر ناول کہا جائے تو پھر سوانح امیر علی ٹھگ کو بھی ناول کہنا ہوگا۔ یادوں کی برات کو بھی ناول کہنا ہوگا۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود ہر حال میں یہ کتاب اردو میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ جسے جناب شیو کے کمار نے D.H Larrance کی ناولوں سے بہتر مواد کی حامل کتاب قرار دیا ہے۔[11]

مظہر الزماں نے ۱۹۸۷ء میں ''آخری زمین'' لکھا جو کہ ناولٹ ہے، اور ۱۹۹۰ء میں ''آخری داستان گو'' ۔۔۔ ''آخری داستان گو'' اردو کا ایک اہم ناول ہے جس میں عصری حسیت کو بڑے انوکھے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں بھی گیان سنگھ شاطر کی طرح خود واحد متکلم (سرنامہ میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ آخری داستاں گو، ہابیل، قابیل دراصل مظہر الزماں خان ہی ہیں۔) اس ناول میں مظہر الزماں خان جو ایک مارگزیدہ (سانپ کا ڈسہ ہوا شخص) کردار پیش کیا ہے جس کا المیہ یہ ہے کہ اگر وہ سو جائے تو مرجائے گا لہٰذا اسے کہانیاں سنا سنا کر جاگتے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور تمام تر ناول میں ایک کے بعد دوسری کہانی بیان ہوتی ہے۔ ناول کے آخری میں سگریٹ پینے والا کردار جب گھڑی کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے کانٹے ہی غائب ہوچکے

مضامین

ہیں۔گھڑی کے کانٹوں کا غائب ہوجانا،عمر کے ختم ہوجانے اور وقت کے لامحدود ہونے کی علامت ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ناول کو'' غیر معمولی'' ۱۲؎ قرار دیا ہے،اور جناب شیو کے کمار اسے ''ہمارے سماج،ہماری سیاسیات اور ہماری معاشرت ہر ایک اچھوتا اور چبھتا ہوا بھرپور طنز'' کہتے ہیں۔۱۳؎

یہ مختصر روداد پچھلے پچیس برسوں میں لکھے جانے والے ناولوں کی ہے۔اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایوان غزل سے آخری داستان گو تک اردو ناول نے اپنی ارتقاء کی منزل کو طے کیا ہے۔گیان سنگھ شاطر کی سوانح اور آخری داستان گو بہ اعتبار موضوع اور طرز بیان جدید عہد کی تمام تر عصری حسیت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں موضوع ہی کا ارتقاء ہی نہیں نظر آتا ہے پلاٹ کی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش بھی ملتی ہے۔(خصوصاً آخری داستان گو اور شاطر میں)اور زبان کا روایتی مزاج بھی یہاں یکسر بدل گیا ہے۔حالانکہ گیان سنگھ شاطر نے پنجابی،ہریانوی،ہندی اور اردو کے امتزاج سے ایک مشترک زبان لکھی ہے۔لیکن جہاں کہیں علامت اور تلازمات کا استعمال کیا ہے۔بڑی عمدہ زبان لکھی ہے۔یہ راستے میں بھی زبان کی شیرنی مل جاتی ہے۔اس مطالعہ کی روشنی میں اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اردو ناول نے اپنے جمود کو توڑا ہے اور یہ فن ارتقاء پذیر معلوم ہوتا ہے امکانات روشن ہیں اور آگے سمندر ہے۔

مضامین

**حوالے:**


۱. بحوالہ یوسف سرمست Henry James "The Future of the Novel"p.9

۲ Novelist On The Novel.p.45 کلاریوز

۳ مضمون "ناول اور دلچسپی"جہان افکار، ص۸۰، ۱۹۸۸ء

۴ نظر اور نظریہ،ص۶۰،مکتبہ جامعہ،۱۹۸۶ء

۵ بحوالہ یوسف سرمست ،ص ۲۳، World literature vol.2.p146

۶ یوسف سرمست،ص The Granite nd Rain Bow p.141

۷ Book filip

۸ گوہر نوشاہی،ص۳۱۴۔

۹ بحوالہ یوسف سرمست،ص۲۹،"Axcels Castle"

۱۱ سیاست مورخہ،۱۲ اکتوبر،۱۹۹۵ء،ص۴.

۱۲ سیاست مورخہ،۷ ستمبر،۱۹۹۵ء

۱۳ سیاست ایضاً،


☆☆☆

پروفیسر حبیب نثار
شعبۂ اردو،یونیورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی،حیدرآباد،تلنگانہ۔500046

# اُردو کے نامور شعراء کے کلام میں حب الوطنی ایک جائزہ

اُردو شاعری نے جہاں ہندوستان کی تمدنی، معاشرتی اور تہذیبی سرمائے کو اپنے میں سمویا اور اس کی ترجمانی کی وہاں اُس نے اُن تمام مذاہب کو جو ہندوستان میں پیدا ہوئے یا جنھیں ہندوستان میں آکر بسنے والی قومیں اپنے ساتھ لائی ہیں، اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔

ہندوستان زندگی کا سماجی، معاشرتی اور اخلاقی ڈھانچہ صدیوں سے مذہبی بنیادوں پر قائم رہا ہے اور آج بھی ہندوستانی سماج کے لئے مذہب بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ آپس کی یگانگت اور رواداری یا وسیع معنوں میں قومی یکجہتی کے پیچھے مذہبی رواداری اور مذاہب کی تعلیم میں انسانیت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُردو ادب اور اُردو شاعری کا منصب یہاں کبھی تنگ نظری نہیں رہا بلکہ ہر مذہب اور ہر مذہبی رہنما کی تعظیم و تکریم اُردو شاعری کا شیوہ رہا ہے۔ اردو شاعری میں جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام کے اوصاف اور صفات بیان کئے جاتے ہیں تو وہیں شیو جی، رام چندر جی، سری کرشن، مہاتما گوتم، مہاویر سوامی اور گرونانک کے علاوہ دیگر مذاہب کے بارے میں تعریف وتوصیف بھی کی جاتی ہے۔

رام چندر جی اگر بدی کے خلاف جنگ آرا ہوتے ہیں تو سری کرشن فتنہ وشر کے خاتمہ پر تلے نظر آتے ہیں تاکہ ایک صالح معاشرہ جنم لے سکے، جہاں کسی کے حقوق کی پامالی نہ ہو۔ مہاتما بدھ اور مہاویر سوامی جنگ وجدول سے نفرت کرنے اور امن وشانتی اور عدم تشدد کی تعلیم دیتے ہیں، حضرت عیسیٰ اگر مظلوم انسانیت کا سہارا بنتے ہیں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانی برادری کو مساوات کا زرین اُصول بناتے ہیں اور غلامی کی لعنت اور رنگ ونسل کے امتیازات کو ختم کرکے انسانیت کا وقار اونچا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عقائد اور رسومات سے قطع نظر ہر مذہب کے بانی کا بنیادی جذبہ ایک ہی رہا ہے کہ انسان اشتراک عمل کرے اور باہمی محبت اور رواداری کے رشتہ میں منسلک ہوجائے۔

اُردو شاعری نے نہ صرف تمام مذہبی رہنماؤں پر عقیدت سے پر نظمیں پیش کی ہیں بلکہ تمام الہامی اور مذہبی کتابوں کے منظوم تراجم بھی پیش کئے۔ منشی شنکر دیال فرحت، منشی جگن ناتھ خوشتر، منشی دوارکا پرساد افق، اقبال ورما سہنگامی، رام سہائے تمنا کے رامائن کے تراجم، منشی طوطا رام شیایاں کا مہابھارت کا ترجمہ، منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی، صنوبر عظیم آبادی، دیوکی نندن مبتدی، جعفر علی خاں اثر منور لکھنوی کے گیتا کے ترجمے، خواجہ محمد دل کا چپ جی صاحب کا ترجمہ، بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے انجیل، جیتی گرنتھ اور قرآن پاک کی مختلف آیتوں کے تراجم یا سیماب کی وحی منظوم وغیرہ اُردو شاعری کا وہ مقدس سرمایہ ہے جسے وہ فخر کے ساتھ پیش کرسکتی ہے۔ ان نظموں کا مطالعہ ہمارا سر اونچا کردیتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان شاعروں نے رام، کرشن، گوتم، مہاویر سوامی اور گرونانک پر

مضامین

نظمیں کہی ہیں اور ہندو اور سکھ شعراء نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسروؒ کو اپنی عقیدت کا منظوم نذرانہ پیش کیا ہے۔ یہ رسمی تخلیقات نہیں ہیں بلکہ جس جذبے خلوص اور عقیدت کی یہ نشاندہی کرتی ہیں ان میں روح اور دل کی گہرائیاں بسی ہوئی ہیں۔ اُردو شاعری کے سیکولر مزاج کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔ محسن کاکوروی نے جو قصیدہ ''مدح خیر المرسلینؐ'' حضرت محمدؐ کی شان میں کہا ہے۔ اس کی تشبیب کی بنیاد ہندوؤں کے مقدس مقامات اور ان کے مذہبی رسومات پر رکھی ہے۔ یہ اقدام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور اسے اس مشترکہ تمدن کی دین کہنا چاہیے جو ہر ایک صورت میں اُردو شاعری صدیوں سے اپناتی چلی آرہی ہے۔ یہاں تک تو ہم نے قدیم اُردو شاعری کے اصناف میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی نشاندہی کی ہے۔ اب ایک نظر جدید شاعری پر بھی ڈالی جائے۔

آزادؔ اور حالیؔ کے دور سے جدید نظم نگاری کی ابتداء ہوتی ہے یہ بدلتے ہوئے حالات کا تقاضہ تھا اُردو شاعری براہ راست وطنیت اور قومیت کے جذبے سے سرشار ہونے لگی تھی۔ حب وطن کی جولے حالیؔ اور آزادؔ، اسماعیلؔ میرٹھی، سرورؔ جہاں آبادی اور چکبستؔ سے چلی اُس کے پیچھے ملک کے سماجی اور سیاسی عوامل کارفرما تھے یہ لے زمانے کے ساتھ بڑھتی چلی گئی اور ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکات کو اپنے میں سموتی گئی۔ ہر سماجی اور سیاسی واقعہ جیسے اُردو شاعری کو از بر ہو، کوئی منزل اور کوئی موڑ ایسا نہیں ہے جہاں اُس نے ساتھ نہ دیا ہو، اُسے اپنے دل کی آواز میں نہ ڈھالا ہو۔ ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ اُردو زبان ہی نے ہماری جنگ آزادی کو دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ کو اُردو نظموں نے اپنے خونِ دل سے لکھا اور اسے دوست دشمن بھی مانتے ہیں اقبالؔ، جوشؔ، اور فراقؔ اور اُن کے تمام ہم عصر شعراء اور اُن کے بعد آنے والے ترقی پسند شاعروں کی نسل نے یہ جنگ اپنے قلم سے لڑی ہے اُردو شاعری نے ملکی سیاست کو کس طرح اپنایا اور کیا خدمات انجام دی۔ اس کی تفصیل ایک الگ بحث ہے یہاں عرض کرنا یہ ہے کہ اپنے ملک کے عظیم کارناموں پر فخر کرنا اور اپنی دھرتی کے ذرّے ذرّے سے محبت کرنا ایک نفسیاتی بات ہے۔ انسان جس دھرتی پر رہتا بستا ہے اس کے اقتصادی اور تہذیبی رشتوں کی جڑیں اُس دھرتی میں بہت گہری ہیں اور یہی وہ بندھن ہے جو وطنیت کے جذبہ کی بنیاد ہے آریاؤں سے لے کر مسلمانوں تک جتنی بھی قومیں آئیں اور یہاں رچ بس گئیں اُن کے لئے ہندوستان اپنا وطن بن گیا۔

بہر کیف اُردو نے جہاں اس سرزمین کی ایک ایک چیز کو گلے سے لگایا وہاں اس ملک کی عظمت کے ترانے بھی گائے، جو نظمیں اس موضوع پر شامل ہیں اس میں علامہ اقبالؔ کی نظم ''قومی ترانہ''، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''نیا شوالہ'' وغیرہ ہیں۔ جو متحدہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور متحدہ ہندوستان ہی میں سپرد خاک ہوئے۔ اقبالؔ کی یہ نظم جنگ

مضامین

آزادی کے دوران ترانہ کی حیثیت اختیار کرگئی تھی اور جب ہندوستان آزاد ہوا تو اعلان آزادی کے جشن میں ٹیگور کے جن گن من کے ساتھ جو آج ہمارا قومی ترانہ ہے اقبالؔ کا یہ ترانہ بھی گایا گیا تھا۔

اُردو شاعری کے عام رجحان کے مطابق اب تک ہندوستان کی عظمت رفتہ پر آنسو بہانا ہی قومی ہمدردی سمجھا جاتا تھا۔ حالیؔ اور آزادؔ مغرب کی مادّی ترقی سے روشنی لے کر قومیت کا نیا تصور پیش کرنے کے لئے ادبی میدان میں اُتر آئے۔ اُن کی ادبی کاوشوں نے اُردو شعراء میں سیاسی شعور پیدا کرکے قوم اور وطن کے تصورات کو واضح کیا اور ہندوؤں، مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے پر زور دیا۔ عوام کو ایک مشترکہ محاذ پر متحد کرکے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا قوم کی پہلی منزل قرار پایا۔

حب الوطنی کا جذبہ ہی چوں کہ عوام کو قوم پرستی، ایثار، عمل، اتحاد اور یگانگت کا درس دے کر اُن کی سوئی ہوئی قوتوں میں حرکت عمل پیدا کرسکتا ہے۔ اس لئے 'حب الوطنی' کے جذبات سے محروم کوئی قوم آزادی کی برکتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔

وطن ہی ایک ایسا مرکز تھا جہاں تمام اہل وطن کو متحد کیا جاسکتا تھا، آزادؔ اور حالیؔ کے علاوہ اُن کے معاصرین کے حب الوطنی کے گیتوں سے قوم کو شجاعت، بہادری اور ایثار کا پیغام ملا، عوام کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور وہ متحد ہونے لگے۔ آزادؔ نے اپنی مشہور نظم ''حب وطن'' میں وطن کے متعلق اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار کیا ہے:

اب میں تمہیں بتاؤں کہ حُب وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا
حُبّ وطن ہے جلوہ اسی نور پاک کا
اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا

انھوں نے ادبی موضوعات میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے اُردو شاعری کے لئے کچھ نئی سمتیں متعین کیں۔ شاعری میں نازک خیالی کے مقابلے میں حقیقت نگاری اور اثر آفرینی پر زور دیا۔ تقاضائے وقت کے مطابق حالیؔ نے بھی اُردو شاعری کے رنگ و آہنگ کو بدلنے پر زور دیا اور ''انجمن پنجاب'' کے زیر اہتمام موضوعات پر مشتمل چار مشاعروں میں شرکت کی اور برکھارت، نشاط اُمید، حب وطن، مناظرہ رحم وانصاف لکھ کر نظم نگاری کے باب میں ایک نیا اضافہ کیا۔

حالیؔ نے حب الوطنی کے سیاق وسباق میں اپنی دھرتی، اپنی مٹی اور یہاں کے رواجوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس سے ان کی تہذیبی اور سماجی فکر کی بالیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ حالیؔ باغ اور چمن، اجرام فلکی، ٹھنڈی ہواؤں، بلبلوں اور پہاڑوں کی دلکش فضاء کو مخاطب کرتے ہوئے نظم ''حب وطن'' کا آغاز کرتے ہیں:

اے سپہر بریں کے سیارو!
اے فضائے زمیں کے گلزارو

مضامین

حالؔی نے اس نظم میں محض قوم کی بدحالی کو ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ اہل قوم کے شانے کو بھی جھنجھوڑا ہے' اُخوت اور ہمہ گیر محبت' اتحاد اور مساوات کی اہمیت کو بھی روشن کیا ہے۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اُٹھو اہل وطن کے دوست بنو....

اس کے علاوہ انھوں نے اس نظم میں تعلیمی پسماندگی اور سماجی خرابیوں کو 'حب الوطنی' کے ساتھ ساتھ پیش کیا۔

محمد حسین آزادؔ نے جس طرح اس زمانے میں موضوعاتی نظم نگاری کی تحریک چھیڑی تھی اس کی نظیر اُردو شعر وادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انھوں نے جذبۂ 'حب الوطنی' کو بھی شعری پیکر عطا کیا ہے' حب الوطنی' کے عناصر میں کچھ ایسے عناصر بھی ہوتے ہیں جن میں معاشرے اور ملک کی تہذیبی وثقافتی جھلکیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔

حب الوطنی کے فطری جذبے کو فروغ دینے کے لئے ہر دور اور ہر عہد میں قلم کاروں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ادب' شاعری وصحافت نے جذبۂ حب الوطنی کو بڑھانے میں ہمیشہ کلیدی کردار نبھایا ہے۔ ایک شاعر جب پرجوش انداز میں وطن کی محبت کے گیت گاتا ہے تو اُسے سن کر ہزاروں نوجوان وطن پر جان دینے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آزادؔ کی ایک نظم ''حب وطن'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

سب اپنے حاکموں کے لیے جان نثار ہوں
اور گردنِ حریف پر خنجر کی دھار ہوں
علم وہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

ooo

لبریز جوشِ وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوقِ خاص و عام ہوں

حالؔی اور آزادؔ کے علاوہ اس دور کے جدید شعراء میں اسماعیل میرٹھیؔ نے بھی اتحاد انسانی اور حب الوطنی نیز معاشرتی مسائل کو بھی موضوع سخن بنایا۔ اسماعیل میرٹھیؔ نے مسلم معاشرے اور ملی مسائل کو زیادہ جگہ دی۔

سرورؔ جہاں آبادی کی شاعری کا بھی یہی دور ہے انھوں نے بھی آزادؔ' حالؔی' شبلیؔ' اسماعیل میرٹھیؔ کی طرح اخلاقی اور اصلاحی نظمیں کہیں قومی اور تہذیبی وتمدنی اساس کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ تہذیب وثقافت انسانی زندگی کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے جس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ اس کا رشتہ اخلاق سے بھی ہے اور تعلیم وتربیت سے بھی' قومی وملی عناصر سے بھی ہے اور خاک وطن سے بھی۔ مذہبی اقدار سے بھی ہے اور سیاسی حالات سے بھی۔ حب الوطنی سے بھی ہے اور احساس ترقی سے بھی۔ غرض سرورؔ کی نظموں میں یہ عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ سرور کی ذہنی وفکری ارتقا میں ہندوستانی آب وہوا اور دوسرے تہذیبی وثقافتی عناصر کارفرما رہے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے حب الوطنی کے

مضامین

نغمے بھی الاپے اور تہذیبی قدروں کی پامالی کو بھی موضوع بنایا اور اس کے اسباب و عمل بھی بتائیے۔ اس عہد میں حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہو کر شاعری ہو رہی تھی۔ آزادؔ، حالیؔ اس نوع کی نظمیں کہہ چکے تھے: سرور کی نظموں سے یہ مصرے ملاحظہ کیجئے:

آہ اے عروس حب وطن میرے بر میں تو
آنکھیں تری تلاش میں ہیں محو جستجو
تیری دیوا ستھان دیوی دل کے کاشانے میں ہے
تیری تصویر مقدس ہر صنم خانے میں ہے
لکشمی تو ہے زمانے میں اُجالا ہے ترا
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالہ ہے ترا

حب وطن سے متعلق ان کی اور بھی کئی نظمیں ملتی ہیں۔ جیسے یاد وطن، قومی نوحہ، جلوہ اُمید، بدنصیب بنگال، رندو غربت، حسرت وطن، مادر ہندو غیرہ۔ اسطرح انہوں نے مادر وطن کی عظمت کے گیت گائے اور اقدار قدیم کی شکست وریخت پر رقت بھری کیفیت دل کا اظہار بھی کیا۔

مولوی عبدالحق نے اقبالؔ کی زندگی اور شاعری کے دو خاص دور قائم کئے ہیں۔ ایک دور وہ جو ابتداء سے لے کر 1905ء تک یعنی انگلستان جانے سے پہلے تک کے زمانے پر محیط ہے۔ دوسرا وہ جو یورپ جانے کے بعد سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ پہلا دور معنوی اعتبار سے ''ہمالہ'' نظم سے شروع ہو کر ''نیا شوالہ'' پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کی نظموں میں ''ہمالہ'' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اور ''ترانہ ہندی'' وغیرہ اسی نظمیں ہیں جو ہندوستان سے اقبالؔ کے گہرے لگاؤ کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن ''نیا شوالہ'' شاعر کے انتہائے کمال کا نمونہ ہے۔ اس کے ہر شعر میں وطن کی آگ بھری ہوئی ہے اور وحدانیت واتحاد کا راز چھپا ہوا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے مادر وطن کی تعریف تاریخی پس منظر میں پیش کی ہے:

''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا ایک بند ملاحظہ کیجئے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاراریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اقبالؔ نے ہندوستان سے سچی محبت اور وابستگی کا ثبوت ان اشعار کے ذریعہ کی ہے:

سچ کہدوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہوگئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اُس کا کلس ملادیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مٹے پیت کی پلادیں

مضامین

شاعر شباب جوشؔ ملیح آبادی اپنی نظم ''وطن'' میں فرماتے ہیں:

اے وطن آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں
آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تمنائی ہیں
مدتوں سے ترے جلووں کے تماشائی ہیں
ہم تو بچپن سے ترے عاشق وسوداتی ہیں

رگھوپتی سہاتے فراقؔ گورکھپوری نے بھی اپنی نظم ''مادر ہند'' میں یہ پیغام دیتے ہیں کہ:

اے مادر ہند! صبح تیرے، تیری شام
ہیں ساقیٔ دوراں کے چھلکتے ہوئے جام
لمحوں میں ترے رازِ ابد پنہاں ہیں
تیری سانس ایک پیغامِ دوام

ان تمام شعراء کے کلام میں ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی نشانیاں ملتی ہیں۔ ہندوستان کی مٹی اور مٹی کی خوشبو، مناظر قدرت، پھولوں کی رنگت، لالہ صحرائی کا ذکر اور خاک وطن سے اٹوٹ محبت، اِن کے کلام کا طُرّۂ امتیاز ہے۔ علامہ اقبالؔ کا یہ مصرعہ:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

☆☆☆

ڈاکٹر محمد موسیٰ اقبال
اسسٹنٹ پروفیسر و چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز
شعبۂ اُردو، تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد
موبائل: 9948493729

مضامین

## مچھلی ہماری صحت کے لئے فائدہ بخش

ہم لوگ سردی سے بچنے کے لئے اپنی خوراک میں طرح طرح کے میوہ جات، مزے مزے کے سوپ، پکوان اور مچھلی کا استعمال بڑھا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کئی قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں مشہور اقسام بام، رہو، گلفام، ٹراؤٹ، مشاہیر، سلور، سنگھاڑا اور تھیلہ قابل ذکر ہیں خیر مچھلی کی ہر قسم میں قدرت نے ہمارے لئے بے شمار فوائد چھپا رکھے ہیں جن سے ہمیں بھر پور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ مچھلی میں پوٹاشیم، فولاد، آئیوڈین، پروٹین، وٹامن اے، وٹامن 12، وٹامن ڈی، سلینیئم، فاسفورس اور میگنیشم پایا جاتا ہے۔ اس میں پروٹین 60%، چربی 10%، وٹامن اے 50%، سلینیئم 67%، فاسفورس 33% اور میگنیشیم 16% موجود ہوتا ہے۔ مچھلی ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور استعمال کرنا چاہئے۔ جب آپ بازار سے مچھلی خریدنے جائیں تو تازہ مچھلی ہی خریدیں۔ تازہ مچھلی کی پہچان یہ ہے کہ پہلے مچھلی کی آنکھیں دیکھیں اگر ان میں چمک ہے تو یہ تازہ مچھلی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے جسم کو انگوٹھے سے دبائیں اگر جسم پر گڑھا پڑ جائے تو یہ تازہ مچھلی نہیں ہے اسی طرح اس کے پروں کو کھینچ کر دیکھیں اگر آسانی سے علیحدہ ہو جائیں تو یہ بھی خراب مچھلی کی نشانی ہے اس کے علاوہ گلپھڑے سے دیکھیں کہ وہ سرخ ہے تو تازہ ہے اور اگر کالا ہے تو پرانی مچھلی کی نشانی ہے۔ بچوں کو مچھلی ضرور دیں کیونکہ اس سے ان کی یادداشت بہتر ہوتی ہے اور ان کی نظر بھی تیز ہوتی ہے۔ مچھلی دماغ اور یادداشت کے لئے فائدہ مند ہے۔ مچھلی دل کے لئے مفید ہے۔ مچھلی ہماری ہڈیوں کو بھی مظبوط بناتی ہے۔ الزائمر کے مریضوں کے لئے انتہائی مفید ہے۔ مچھلی کھانے سے آپ ذہنی تناؤ سے بچے رہتے ہیں۔ مچھلی کھانے سے جسم میں خون جمنے نہیں پاتا۔ مچھلی کھانے سے آپ ذیابیطس جیسے مرض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ مچھلی کھانے سے آپ سرطان سے بچ سکتے ہیں۔ مچھلی بلڈ پریشر کے مریضوں کے لئے انمول تحفہ ہے۔۔۔ (ماخوذ)

# غزل کا فن

اردو ادب میں صنف غزل سب سے مقبول صنف ہے، ویسے تو اردو ادب میں کئی اصناف نے اپنے قدم جمانے کی کوشش کی جیسے مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ، لیکن جب نظم نگاری کا آغاز ہوا تو صنف غزل کو نظم نے کچھ پیچھے چھوڑ دیا، لیکن سلسلہ ختم نہیں ہوا غزل کا جب احیاء ہوا تو اس نے تمام اصناف اور پر سبقت کر لی۔ جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

غزل کا دائرہ ابتداء میں بہت محدود تھا، اگر ہم آج غزل کے دائرہ کار پر نظر ڈالیں گے تو پتہ چلے گا کہ غزل کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے اندر ہر موضوع سمیٹنے کی گنجائش ہے، ابتداء میں غزل صرف عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں بات کرنے یعنی عشق مجازی و حسن پرستی تک محدود تھا۔ اردو میں غزل گوئی کا آغاز فارسی شاعری کے زیر اثر ہوا۔ تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے صنف غزل ایک ایسی صنف ہے جو اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ اردو کو فارسی شاعری سے ملی ہے۔ چنانچہ پروفیسر آل احمد سرورؔ اردو غزل کی ابتداء اور غزل موضوعات کی وسعت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اردو غزل پر فارسی کا اثر بہت گہرا ہے مگر یہ فارسی کا چربہ نہیں۔ یہ ہندوستانی تہذیب کو ایک جلوہ صد رنگ ہے چنانچہ اس میں لوک گیتوں کی روایت ہندوستان کے موسم، تیوہار، رسم و رواج، مجلسی اور تمدنی زندگی کے کتنے ہی نقوش محفوظ ہو گئے ہیں''۔

(بحوالہ اردو غزل ہند پاک غزل سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ: مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی اردو اکادمی دہلی، ص:۱۲)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنف غزل نے اپنے اندر تمام موضوعات کو سمویا ہے، جیسے، لوک گیتوں میں ہندوستان کے موسم، اس کے تیوہار، رسم و رواج اور زندگی کے تجربات کا بیان ملتا ہے۔ اردو شاعری کی تمام تر اصناف میں غزل ہی وہ صنف سخن ہے جس پر آج تک سب سے زیادہ لکھا گیا ہے، کیونکہ اس میں شاعر اپنے احوال عشق کے علاوہ اپنی زندگی کے تمام تجربات' کیفیات و مشاہدات کو بڑی خوبصورت کے ساتھ پروتا ہے، چنانچہ غلام آسی رشیدی غزل کی تعریف کرتے ہوئے اس کی وسعت پر روشنی ڈالتے ہوئے صنف غزل کو تمام شعری اصناف میں اسے نازک ترین صنف قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''غزل اپنی مخصوص علامتوں کے ذریعہ حسن و عشق کیفیات و واردات عشق، اخلاق و تصوف، فلسفہ اسرار و رموز، حیات و کائنات اور زمانے کے حالات و کوائف بیان کرنے کا فن ہے جس میں حاوی رجحان حسن و عشق کا ہے' غزل کی مخصوص لفظیات سے مراد یہ ہے کہ غزل تمام شعری اصناف میں نازک ترین صنف ہے''۔ (غالم آسی رشیدی، اردو غزل کا تاریخی ارتقاء، ص:۳۲۹)

اس اقتباس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمام شعری اصناف میں غزل ہی وہ صنف سخن ہے جس میں عشق کی واردات و کیفیات کے علاوہ روح کی تسکین اور تمام تجربات کا اظہار آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ غزل کی اسی خصوصیات کی بناء پر آج غزل تمام اصناف ادب سے آگے نکل گئی ہے لیکن کسی بھی صنف کی پہچان اس کی ہیئت، موضوع جمالیات، وغیرہ سے ہوتی ہے، اس لئے غزل کی شناخت ان اجزاء کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

۱) **وزن یا بحر:** صنف غزل میں یہ عنصر سب سے اہم و لازمی ہے۔ وزن یا بحر سے ہی شعر میں نہ صرف موزنیت و موسیقیت آتی ہے، بلکہ یہ غزل کی زمین کو طے کرتی ہے، کیونکہ ردیف و قافیہ بحر کے تابع رہتے ہیں۔ بحر اور قافیہ کی مدد سے ہی آہنگ کو خوشگوار نہیں بنایا جاتا ہے بلکہ روانی اس کی جمالیات کو بنیادی حصہ ہے، یوں تو صنف غزل میں اوزان کے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ دراصل نئے آہنگ اور نئی بحروں کے استعمال سے ہی غزل میں جدت و تنوع پیدا ہوتا ہے۔

مضامین

**۲) قافیہ:** بحر کی طرح قافیہ بھی غزل کا اہم عنصر ہے کیونکہ وزن اور قافیہ کے بغیر غزل کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ غزل میں قافیہ کی اہمیت کا ہم اس بات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ غزل کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے، یعنی اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

**۳) ردیف:** غزل کے لئے قافیہ کی طرح ردیف کی بھی اہمیت اپنی جگہ اہم ہے، کیونکہ ردیف سے غزل کی موزونیت و موسیقیت بڑھتی ہے اس کے علاوہ ردیف سے غزل کے ایجاز و اختصار پر اثر پڑتا ہے۔

**۴) مطلع، مقطع اور تعداد اشعار:** صنف غزل میں غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے، مطلع سے غزل کی بحر اور اس کے قافیہ و ردیف کا تعین ہوتا ہے۔ کیونکہ مطلع سے مقطع تک قافیہ میں پروئی جاتی ہے، غزل میں ایک سے زائد مطلع کی گنجائش ہوسکتی ہے، اگر دوسرا مطلع ہو تو اس کو حسن مطلع کہتے ہیں، جب کہ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اس کو مقطع کہا جاتا ہے، مقطع سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی بات مکمل کر لی ہے، غزل کی ہیئت کے لحاظ سے غزل کے مطلع اور مقطع کے درمیان کم از کم تین دیگر اشعار کا ہونا لازمی و ضروری ہے، اردو غزل میں پانچ اشعار سے بھی کم اشعار کی غزل بھی ملتی ہے، لیکن پانچ اشعار سے زیادہ کی غزلیں صنف غزل میں زیادہ ملتی ہیں۔

**۵) قطعہ بندی اور مسلسل غزل:** غزل کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنے اندر مکمل ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی غزل میں شاعر اپنے معنی کی تکمیل ایک سے زائد اشعار میں کرتا ہے تو اس کو قطعہ بندی کہا جاتا ہے۔ مسلسل غزل کا ہر شعر معنی و مفہوم کے لحاظ سے خود مکمل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی تمام غزل کے اشعار معنی و مفہوم کے لحاظ سے خود مکمل ہوتے ہیں' ساتھ ہی تمام غزل کے اشعار میں بھی مجموعی تسلسل کا تاثر بھی قائم رہتا ہے۔

**۶) اشعارے کی مرکزیت و اہمیت:** اشعارہ سازی غزل کا بنیادی فن قرار دیا جاتا ہے، غزل کے شعر میں معنی تو ہوتے ہی ہیں الفاظ کے لغوی مفہوم سے بنتے ہیں لیکن اس کے جو مجازی معنی نکلتے ہیں وہی غزل کا اصل مقصود ہے اشعارے کے بغیر غزل کا شعر کلام منظوم سے آگے نہیں بڑھتا اس لئے غزل میں اشعارہ ہی کی بدولت معنی کی کثرت سے لامحدود معنی و امکانات نکالے جاتے ہیں۔

**۷) معنی آفرینی:** غزل کا فن سمندر کو کوزے میں سمائے ہوتا ہے یعنی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرنے کی گنجائش ہو۔ شاعر کو دو مصرعوں میں اپنی بات مکمل کرنی ہوتی ہے، اس لئے شاعر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جس میں معنی و مفہوم کے امکانات زیادہ ہوں، جیسے اشعارہ سازی کے ذریعہ شاعر ایک کلام کہتا ہے۔

**۸) فنی جمالیات:** صنفِ غزل میں روانی، ربط اور بندش اہمیت کے حامل ہیں اور ان عناصر کے بغیر ایک کامیاب غزل کا تصور ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ شعر کے الفاظ مربوط نہ ہوں یا دونوں مصرعوں کا معنوی ربط نہ ہو تو وہ غزل اپنا اثر کھو دیتی ہے۔

چنانچہ غزل کے فن کو سمجھنے کے لئے یہ تمام عناصر نہایت اہم ہیں۔ غزل نے ہر دور میں اپنے آپ کو ثابت کیا ہے۔ آج جتنے موضوعات اردو غزل میں سموئے گئے ہیں کسی اور صنف میں نہیں ملتے۔ آج غزل کا حلقہ و دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کا موضوع عشق سے نکل کر زندگی کی حقیقت سے روشناس ہو چکا ہے۔ غزل کے اس طویل سفر میں اس نے کئی اتار چڑھاؤ طئے کئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ آج کامیاب صنف کے طور پر آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر واجدہ بیگم' اسسٹنٹ پروفیسر' شعبہ اردو' انوار العلوم ڈگری کالج' نیو ملے پلی' حیدرآباد 001 500

مضامین

# فرینسس. ڈبلیو پرچٹ اور اُردو زبان وادب

شرق شناسی کی اصطلاح عام معروضیت پسند مفکرین کے نزدیک غیر پسندیدہ ہے کیوں کہ اس سے نو آبادیاتی اور استبدادی نظام کی بو آتی ہے اور یہ مغرب کی سامراجی توسیع پسندی، مشرق پر حصول تسلط وتغلب اور غلاموں کو غلامی پر رضامند رکھنے کا ایک مؤثر آلہء کار اور سیاسی ایجنڈہ ہے۔ایسے مفکرین شرق شناسی کے لیے مطالعات شرق یا علاقائی مطالعات کی اصطلاح کو زیادہ معروضی اور بلیغ سمجھتے ہیں۔ مشہور عالمی شرق شناس ایڈورڈ سعید بھی کم وبیش اسی طرح کے خیالات کے حامی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"that orientalism enables the political ,economic,cultural and social domination of the West not just during colonial times but also in the present"

شرق شناسی کے تئیں اس عام خیال اور روش کے باوجود ہمارا خواندہ اور نیم خواندہ معاشرہ مذہب سے لے کر کھیل تک کے ہر میدان میں شرق شناسوں کی علمی خدمات سے مرعوب اور ان کا معترف ومداح ہے۔شاید ہمارے اسی عام رویے اور روش کے باعث ماہر علمیات وقدیم ہندوستانیات اور ہند۔یوروپی زبانوں کے مابین راست لسانیاتی رشتوں کے مؤکل اور سنسکرت کو دنیا کی بیشتر زبانوں کا ماخذ قرار دینے والے مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم جونس (1794-1746) نے شرق شناسی کی تائید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ ہندوستان سے مثبت رشتوں کو استوار رکھنے اور اسے مزید فروغ دینے میں ایک آلہ کار ثابت ہوسکتی ہے۔اور ہمیں ہند ثقافت،عرب ثقافت اور اسلامی ثقافت کا مطالعہ بھی یوروپی ثقافت کے طرز پر ہی کرنا چاہیے۔ایسے مستشرقین کی ایک بڑی طویل فہرست ہے جنھوں نے سر ولیم جونس کے نظریہ کی اتباع کرتے ہوئے اردو زبان وادب کی بڑی وقیع اور گراں قدر خدمات انجام دیں۔گارساں دی تاسی، گریرسن، گراہم بیلی، گل کرسٹ، سی۔ شیکل، انا مری شمل، رالف رسل، ڈیوڈ میتھوز، وی۔ جی۔ کرنان، نوئمی لیزارڈ اور فرینسس ڈبلیو پرچٹ وغیرہ تو سامنے کے نام ہیں۔زیادہ تر مستشرقین کا تحقیقی جذبہ قابل رشک اور ان کی علمی خدمات منفرد اور نمایاں ہیں۔بعض مستشرقین کے علمی سروکار سکہ بند اہل اردو زبان وادب کے لیے بھی مشعل راہ ہیں۔ایسے ناموں میں سے ایک نام ڈاکٹر فرینسس ڈبلیو پرچٹ (پروفیسر ایمریٹس) کا بھی ہے۔

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ(Fraces W. Pritchett) کا بنیادی تعارف یہ ہے کہ 1982 سے 2013 تک امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں زبان وادب کی پروفیسر تھیں اور انھوں نے شکاگو یونیورسٹی سے ''جنوب ایشیا کی زبانیں اور تہذیبیں'' پر پی ایچ۔ڈی کی ہے۔اس کے بعد اپنی پوری زندگی اسی موضوع بشمول اردو کے لیے وقف کردی۔ابتداً انھیں اردو سے بہت زیادہ دل چسپی نہیں تھی لیکن اردو کا سحر ایسا چلا کہ جنوب ایشیا کی دوسری زبانوں اور تہذیبوں سے سروکار روز بروز کم ہوتا چلا گیا۔انھوں نے اردو زبان وادب بالخصوص کلاسکی نثر کی قابل رشک تحقیق وتدوین کی اور پھر انھیں انگریزی قالب میں بھی ڈھالا۔اس طرح انھوں نے اپنی تحقیقی وتنقیدی کتابوں اور مقالوں سے اردو داں طبقے کے علاوہ غیر اردو داں طبقے کو بھی اردو زبان وادب کے شاہکاروں سے متعارف کرایا۔

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ کو کلاسکی نثر بالخصوص داستانوں سے خاص دلچسپی ہے۔طلسم زعفران زار سلمانی، طلسم خیال، دفتر آفتاب شجاعت وغیرہ ان کے قابل ذکر نثری کارنامے ہیں۔ Marvelous Encounters: Folk Romance in Urdu and Hindi بھی ان کی ایک اہم کتاب ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے فن شعر بالخصوص عروض پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔اس حوالے سے ان کی تحریر کردہ Urdu Meters اور Nets of Awareness:Urdu Poetry and Its Critics بھی کافی اہم ہے۔

مضامین

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ نے اردو کی سب سے طویل، ضخیم اور اہم داستان 'داستان امیر حمزہ' کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا اور اس کا نام The Romance Tradition in Urdu: Adventures from the Dastan of Amir Hamza رکھا۔ اس کے علاوہ 'طلسم ہوش ربا' کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا اور قصہ مادھونل و کام کندلا جسے فورٹ ولیم کالج کے اہم مترجم اور اردو کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کے بڑے عالم للولال مظہر علی ولا نے برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا تھا، کا بھی انہوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اردو داستان کے سب سے بڑے قاری، اس کی تنقید و تحسین کے نظریہ ساز اور داستان تنقید کی بوطیقا ''ساحری، شاہی اور صاحب قرانی'' تحریر کرنے والے شمس الرحمٰن فاروقی کا ماننا ہے کہ ''میں اپنے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ داستان سے میری بے خبری صرف اور صرف کم علمی کی بنا پر تھی۔ اس افسوس ناک صورت حال کی اصلاح کے لیے میں کولمبیا یونیورسٹی کی ڈاکٹر فرینسس پرچٹ کا ممنون رہوں گا کہ انھوں نے مجھے داستان کی طرف باصرار متوجہ کیا۔''

شمس الرحمٰن فاروقی جیسے محتاط اور سخت گیر ناقد کے یہ معترفانہ جملے اردو کے کسی عالم وہ بھی مستشرق کے لیے یقیناً سند اور سرمایہ افتخار ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی داستان کے بارے میں مغربی علما کی خدمات کا تقابلی محاکمہ کرتے ہوئے فرینسس پرچٹ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مغرب میں داستان کے بارے میں سب سے پہلے گلکرسٹ اور پھر گارساں دتاسی نے لکھا۔ لیکن ان کی تحریریں محض اطلاعاتی نوٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نسبتاً مفصل اور کچھ تنقیدی نظر کے ساتھ مغربی لکھنے والوں میں رالف رسل سرفہرست ہیں۔ انھوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ لیکن انھوں نے داستان کو ناول سے بھڑانے کا بھی کام نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر این مری شمل اور محمد صادق نے داستان کے بارے میں سرسری طور پر اپنی تاریخوں میں لکھا ہے۔ بعد والوں میں سب سے نمایاں نام فرینسس پرچٹ کا ہے۔ انھوں نے یک جلدی داستان امیر حمزہ (نولکشوری) کے متعلقہ حصے کا سلیس لیکن اصل سے بہت قریب انگریزی میں The Dastan Tradition in Urdu کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ داستان امیر حمزہ کی مختلف روایتوں پر ایک عالمانہ دیباچہ اور حواشی اس پر مستزاد ہیں۔ (مطبوعہ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک 1991) علاوہ ازیں انھوں نے کئی مفصل مضامین لکھے ہیں۔ ان میں داستان امیر حمزہ میں لندھور بن سعدان کے کردار کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ، ایک مضمون داستان کی بیانیہ وضع پر، ایک مضمون داستان میں مزاح پر اور ایک مضمون داستان میں تقدیر کی کارفرمائی کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر موصوفہ کا طریق کار تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی ہے۔''

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ نے تقسیم ہند اور زوال احترام آدمیت پر مبنی انتظار حسین کے اہم ناول 'بستی' کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور آصف فرخی نے اس کا تعارف لکھا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کے بعد انتظار حسین مین بوکر انٹرنیشنل پرائز (Man Booker International Prize) کے لیے بھی شارٹ لسٹ ہوئے تھے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ یہ ترجمہ (New Yark Review of Books Classic(NYRB سے 2012 میں شائع ہوا۔ یہاں سے صرف عالمی شہرت یافتہ کتابیں ہی شائع ہوتی ہیں۔ اس ناول پر انگریزی میں لنڈا وینٹک (Linda Wentin) کا بہترین تبصرہ Curfew in Kufa کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس ناول کو انتظار حسین کے فن اور اردو ناول کی ایک اہم کڑی سمجھا جاتا ہے۔ اس ناول کا تعارف کراتے ہوئے مظفر علی سید نے لکھا تھا کہ:

''بستی ایک سیدھی لکیر کا ناول نہیں ہے۔ سیدھی لکیر کے ناول اطمینان سے پڑھے جاسکتے ہیں۔۔۔ اس قسم کے سہ وسعتی ناول کا جس میں انسان، زمانہ اور فطرت تینوں پوری طرح منضبطی کے ساتھ باہم مربوط ہوں کوئی خلاصہ نہیں ہوسکتا ہے بالخصوص جب کہ اس کی بیانیہ تکنیک اور مجموعی ہیئت خاصی پہلودار ہو''۔

مظفر علی سید کا یہ تجزیہ قاری کی فہم کے لیے جس طرح کا بھی چیلنج پیش کر رہا ہو مترجمین کے لیے خاصی دشواری کا باعث ہے۔ اس کی

مضامین

بیانیہ تکنیک، ادبی متن میں مقامی بول چال کی زبان کا کثرت سے استعمال دو مختلف زبانوں میں Colloquial balance قائم رکھنے میں حارج ہوتا ہے۔ تہذیبی متن قدم قدم پر دامن گیر ہوتا ہے اور مترجم دامن بدنداں۔ گرچہ بعض مقامات پر نثر نا قابل ترجمہ ہو جاتی ہے لیکن فرینسس ڈبلیو پرچٹ کی مشاقی اور انتظار حسین کی بازدید ترجمہ میں بھی نثر کے تخلیقی حسن کو برقرار رکھنے میں معاون ہوتی ہیں۔

محمد حسین آزاد کی مقبول اور متنازعہ فیہ کتاب ''آب حیات'' جسے قدیم تذکرہ نگاری اور شاعری کی جدید تنقید وسوانح کا سنگم سمجھا جاتا ہے اور جو لسانی تحقیق، شعری تنقید اور سوانح، انشائیہ، خاکہ اور مرقع نگاری کا ایک عمدہ نمونہ بھی ہے۔ اپنے طریقہ تحقیق وپیش کش کے باعث زمانہ تصنیف 1880 سے لے کر آج تک موضوع بحث ہے۔ قاضی عبدالودود اور حافظ محمود شیرانی نے اس میں تحقیق کی فاش غلطیوں کو نشان زد کیا۔ جمیل جالبی نے آزاد کے مزاجاً افسانہ نگار ہونے، قصہ میں جان ڈالنے کے لیے ڈرامائیت پیدا کرنے کی بات کی۔ کسی نے قیاس آرائی و تخیل کا نمونہ گردانا تو کسی نے اسے ناول سے تعبیر کیا۔ لیکن کسی نے بھی اس کی تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا اور اسے تاریخ نویسی، تذکرہ نگاری اور تحقیق وتنقید کا ایک اہم پڑاؤ سمجھا۔ اسی تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی اہمیت کے پیش نظر پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ اور شمس الرحمٰن فاروقی نے آب حیات کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اس کی اہمیت کے سیاق میں اس کا نام Abe Hayat: Shaping the Canon of Urdu Poetry رکھا۔ یہ ترجمہ پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی مشترکہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ 2001 میں یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی تھی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے پاکسانی نژاد (اصلاً سردار نگر گورکھپور اتر پردیش، ہندوستان) برطانیہ میں مقیم ساقی فاروقی کی 35 نظموں کو A Listening Game : Poem's by Saqi Faruqi کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ساقی فاروقی اور ان کی نظموں کا تعارف پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ نے تحریر کیا تھا۔ 86-1987 میں لوک مایا پریس ہندوستان سے اور 2001 میں لندن سے شائع ہونے والی یہ کتاب ترجمہ کے مختلف طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے کافی اہم ہے۔ پرچٹ کے تعارف اور فاروقی کے منظوم ترجمے نے انگریزی قارئین کے لیے اصل ساقی فاروقی تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے۔

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ اور شمس الرحمٰن فاروقی نے نظیر اکبر آبادی کے شہر آشوب ''دنیائے دوں کے تماشے'' کا ترجمہ The Vile World Carnival:A Sahr-Asob کے نام سے کیا۔ اس شہر آشوب سے پہلے یہ مشترکہ طور پر جرأت کی مخمس شہر آشوب ''حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی'' کا ترجمہ In The Presence of the Nightingale :A Shahr Ashob by Jurat کے عنوان سے کر چکے تھے۔ اس سے پہلے کسی بھی شہر آشوب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ اولاً یہ ان دونوں شہر آشوب کو مرعبہ شعری اصطلاح کی رو سے شہر آشوب نہیں سمجھتے ہیں کیوں کہ جرأت کی نظم میں کوئی سماجیاتی توضیح یا سیاسی تنقید نہیں ہے۔ اسی طرح وہ نظیر کی نظم کو بھی شہر آشوب نہیں سمجھتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی پر تحقیق کرنے والے Jeffery Donaghue کا ماننا ہے کہ نظیر اس نظم میں کبیر کی الٹی بانی سے متاثر نظر آتے ہیں جہاں کمبل برستا ہے اور پانی بھیگتا ہے۔ بہر کیف اس نظم کے عنوان ''دنیائے دوں کے تماشے'' کا ترجمہ بڑا دلچسپ ہے The Vile World Carnival:A Sahr-Asob یعنی دنیائے دوں کے لیے The Vile World کی ترکیب استعمال کی گئی ہے جو کی بالکل درست ہے اور لفظ تماشہ کے لیے Carnival کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ Carnival رومن کیتھولک ممالک میں اربعین یعنی حضرت عیسی علیہ السلام کی یاد میں چالس روزے رکھنے یعنی Lent سے قبل منائے جانے والے تہوار کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل کا تماشہ ترجمے میں تہوار ہو گیا۔ لیکن یہاں منشائے مترجمین خاص کر Frances W. Pritchett کو مخصوص ثقافتی تشریط یا Cultural Conditioning کا

مضامین

پابند نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ نظم کی پوری فضا معکوس اور منقلب حالات کے بیان سے پر ہے اور Carnival کے موقعے پر معکوس اور منقلب حالات کا بیان جدید یورپ کے اوائلی دور کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ بہر کیف پورے ترجمے میں اصل کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ چند ظاہری خامیوں اور دشواریوں کے باوجود یہ ایک کامیاب کوشش ہے کیوں کہ ترجمہ دراصل تجربے کی تشکیل نو اور ترسیل ہوتا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری ترجمہ کی اصل غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ترجمے کا مقصد پایان کار دو زبانوں کے مابین تہذیبی فصل یعنی Barrier کو لمحاتی طور پر ختم کرنا اور مخصوص کلچروں کی مختلف المرکزیت یعنی Eccentricity کو فی الوقت محو کرنا اور باہمی لسانیاتی زرخیزی کو وجود میں لانا ہے۔ ایسا کرنے میں اگر قطعیت کا حصول ممکن نہ بھی ہو تب بھی صحت کے قریب قریب پہنچنے کی کوشش یعنی Approximation بہر حال ضروری ہے۔ کسی بھی زبان کے محاوروں کو مردہ استعاروں کا نام دیا گیا ہے اور استعارے چاہے وہ توانا اور متحرک ہوں یا منجمد مضمحل اور یخ بستہ، وہ پیداوار ہوتے ہیں، مخصوص تہذیبی ماحول اور آب و ہوا کے اور مترجم کا کام دراصل اس تجربے کی تشکیل نو اور ترسیل ہے جس نے کسی زبان کے مزاج اور رنگ روغن کو جنم دیا ہے''

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی پوری کوشش یہ تھی کہ تمام تراجم میں اصل سے وفاداری برتی جائے اور نظم کی نامیاتی اکائی پورے طور سے برقرار و محفوظ رہے۔ اس پر کسی طرح کا ضرب اور حرف نہ آئے۔ شاعر دراصل لفظوں کا زرگر اور لفظی تمثالوں کا جوہری ہوتا ہے اور دوسری زبان میں ترجمہ کے وقت بھی اپنی اس صلاحیت، دست گاہ اور فن کاری پر آنچ نہیں آنے دینا چاہتا ہے۔ شاعری و نثر کے عام مترجمین تجربے کی تشکیل نو اور ترسیل میں اکثر ناکام ہوتے ہیں۔ لیکن پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ جیسی ماہر ترجمہ، باعلم اور مشاق اہل زبان کی موجودگی اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے مشرقی و مغربی ادبیات کی وسیع المطالعہ شخصیت کی عمل ترجمہ میں شمولیت نہایت کامیاب اور مستحسن ثابت ہوئیں اور ترجمہ و تحقیق کے میدان میں دونوں کی مشترکہ کوششیں زبان و ادب کے ساتھ فن ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی سنگ میل قرار پائیں۔

ویسے تو غالب کے مترجمین و مفسرین اور شارحین کی ایک طویل فہرست ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے کلام کے اتنے تراجم ہوئے ہیں کہ ان کی ایک الگ کتابیات (Bibliography) تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ پرتاپ بندو پادھیائے، کے این سود، قرۃ العین حیدر، احمد علی' علی سردار جعفری، یوسف حسین' او۔ پی کچر یوال، اور صوفی عبدالقدیر، کے سی کنڈا، شاہ عبدالسلام، صوفیہ سعداللہ، ثروت حسین، پروفیسر محمد ذاکر، سی ایم نعیم، خورشیدالاسلام، اعجاز احمد، شہاب الدین رحمت، نورالحسن نقوی، بی این رینا، کیدار ناتھ، پون کمار ورما، ڈاکٹر عبدالطیف، اختر انصاری، حسن عبداللہ اور ڈاکٹر اے۔ نصیب خان وغیرہ جیسے اہل زبان نے غالب اور عہد غالب کو غیر اردو داں طبقے سے متعارف کرانے کی کوششیں کی ہیں۔

اس کے علاوہ مستشرقین کی ایک طویل فہرست ہے، جنھوں نے غالبؔ اور عہد غالبؔ کو موضوع تحقیق و ترجمہ بنایا اور غالبیات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ولیم اسٹفورڈ اور اڈرائنے نے Poems by Ghalib، ایم۔ اے۔ آر بارکر نے The Golden Tradition: an anthology of Urdu Poetry، ڈیوڈ میتھوز اور کرسٹوفر سیکل نے An Anthology of Classical Urdu Love Lyrics لکھ کر غالبؔ کو اہل یورپ اور انگریزی داں طبقے سے روشناس کرانے اور اردو کو دوسری دنیا تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ رالف رسل نے (خورشیدالاسلام کے ساتھ) پہلے تو غالب کے خطوط اور ان کی زندگی کے مختلف احوال کا ترجمہ کیا اور اس پر تعارفی نوٹ لکھا۔ یعنی Ghalib: Life and Letters۔ جس کا پہلا حصہ یونیسکو (UNESCO) کے تعاون سے 1969 میں کیمرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا۔ Ghalib: Life and Letters لندن سے جارج ایلن انون George Allen Unwin نے بھی شائع کیا۔ اس کے

علاوہ رالف رسل نے Ghalib: The Poet and His Age کے نام سے ایک جامع مضمون بھی لکھا اور Ghalib's Urdu Verses, Ghalib and Revolt of 1857,On Translating Ghalib وغیرہ کیساتھ ساتھ انھوں نے غالبؔ کے حوالے سے دوسرے مضامین بھی لکھے۔ لیکن غالبؔ کے ترجموں میں رالف رسل (خورشید الاسلام کے ساتھ) کی Ghalib: Urdu and Persian Ghazals کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اس میں غالبؔ کی بہترین ترجمانی ہوتی ہے نیز غالبؔ اور فن ترجمہ اور غالبؔ پر تفصیلی بحث بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ مترجمین نے اپنی بھی سرگذشت بیان کی ہے یعنی ایک دوسری زبان میں ترجمہ کے جو اصول اور تقاضے ہوتے ہیں وہ سبھی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ مستشرقین میں فرینسس ڈبلیو پرچٹ اور رالف رسل کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہے جو اہل زبان میں بڑے بڑے بہی خواہوں کو نہیں ہے۔ یہ اردو کے سچے خادم ہیں۔ ضرورت ہے ان کی خدمات کو عام کرنے اور نیک نیتی سے محاسبہ کرنے کی۔

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ کی خدمات گراں قدر حصہ تحقیق و تدوین اور پھر انگریزی ترجمہ سے متعلق ہے۔ ان کی قابل ذکر مترجمہ کتابوں میں سے ایک Ghalib: Selected Poems and Letters بھی ہے۔ یہ کتاب بھی پرچٹ اور Owen T.A.Cornwall کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ ہے۔ یہ دونوں مشترکہ طور پر ایک اور کتاب Ghalib As a Persian Poet بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ بہرکیف Ghalib: Selected Poems and Letters میں سب سے پہلے اردو ادب یا دوسری زبان و ادب کے عام و مخصوص قارئین کے لیے تنقیدی تعارف پیش کیا گیا ہے جس سے غالبؔ کی پوری شعری کائنات کا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔ غالبؔ کی شعری حکمت عملیوں اور سرہ کاری وضاحت ہوتی ہے۔ غالبؔ کے اشعار کے ہر مصرعے کا ترجمہ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ معانی و مفاہیم کی مکمل ترسیل ہو سکے۔ اصل منشائے غالبؔ تک عام و خاص، اردو داں اور غیر اردو داں قارئین کی رسائی ہو سکے اور شعری حسن بھی مجروح نہ ہو۔ شاعری وہ بھی غزل کا منظوم ترجمہ ماہرین فن کے نزدیک بہت ہی مشکل عمل ہے اور غالبؔ جیسے مشکل پسند، ندرت پسند (خیال اور اظہار دونوں سطح پر)، مخصوص و منفرد انداز بیان کے حامل شاعر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے لیکن پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ اور OwenT.A.Cornwall کی مشترکہ کوششوں یہ بیل منڈھے چڑھ سکی۔ دونوں مترجمین نے غالبؔ کی پوری پوری غزل کا بعض غزلوں کے مشہور اشعار کا اور دیوان غالبؔ میں شامل دوسری شعری اصناف جیسے قطعات، مثنویوں، رباعیوں اور قصائد کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا اور قارئین کی سہولت کے لیے اردو متن، مشکل الفاظ کی فرہنگ اور بعض مترجم اشعار کی غالبؔ کے ذریعے کی گئی تشریح کو ضمیمہ کی شکل میں شامل کیا گیا ہے۔

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ کے بعض کاموں کو اداراہ جاتی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سب سے اہم کام ان کا کولمبیا یونیورسٹی کا وہ ویب سائٹ ہے جو جہان علم و فن کے لیے بنیادی و ثانوی ماخذ کا بحر ذخار ہے اور آن لائن تحقیق، تنقید اور تدوین کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ اس ویب سائٹ کا تقریباً سارا مواد انگریزی میں ہے اور یہاں وہ مواد دستاب ہیں جو جنوبی ایشیائی ممالک کو، ان کی تہذیبی و ثقافتی روایات کو اور ان کے فنون لطیفہ بشمول اردو ہندی زبان و ادب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس ویب سائٹ پر ارتھ شاستر، شکنتلا، گل بدن ابوالفضل، داستان امیر حمزہ، گاندھی کی سوانح اور انتظار حسین کے ناول بستی وغیرہ جیسی لاتعداد سنسکرت، فارسی اور اردو کی کتابوں کے انگریزی تراجم مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ جنوبی ایشیا کو سمجھنے کے لیے دوسرے وسائل سے جیسے ابن بطوطہ اور علی رئیس وغیرہ کی کتابوں اور ہندوستان کی قدیم تاریخ سے مطلق مواد و ماخذ بھی دستیاب ہیں۔ ساتھ ہی اردو کے دو اہم اسکالر شمس الرحمٰن فاروقی اور سی۔ ایم نعیم کے ادبی کاموں کو بھی اس ویب سائٹ پر جگہ دی گئی ہے اور کولمبیا یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے اردو ہندی کا درسی نصاب بھی یہاں دستیاب ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا تھا کہ یہ ویب سائٹ آن لائن تحقیق، تنقید اور تدوین کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال

مضامین

A Desertful of Roses اور A Garden of Kashmir دونوں رواں پروجیکٹ ہیں۔ A Desertful of Roses مرزا اسداللہ خاں غالب کی غزلوں کے معانی ومفاہیم، شعری خصائص اور امتیازات اور مختلف النوع تحقیقی وتنقیدی جہات پر مشتمل ہے۔ جیسے غالب کا شعر جس سے انھوں نے اپنے اس پروجیکٹ کا نام اخذ کیا ہے:

دستگاہ دیدہ خونبار مجنوں دیکھنا  یک بیاباں جلوہ گل فرش پا انداز ہے

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ پہلے اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ کرتی ہیں۔ پھر وضاحت طلب الفاظ جیسے دستگاہ، دیدۂ خونبار، جلوہ، فرش اور پاانداز کے مختلف معانی ومطالب نقل کرتی ہیں۔ اس کے بعد نظم طباطبائی، بیخود موہانی اور بیخود دہلوی وغیرہ کی بیان کردہ شرح نقل کرتی ہیں۔ اور آخر میں اپنے خیال قلم بند کرتی ہیں۔ جس میں شعر میں مستعمل مخصوص الفاظ کہاں کہاں اور برتے گئے ہیں، مستعمل لفظوں میں کیا رعایت ہے۔ ادب کے علاوہ دوسری جگہ وہ کن معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ جیسے اس شعر میں مستعمل الفاظ دستگاہ اور پانداز میں موجود رعایت لفظی، دستگاہ اور انداز کا موسیقی سے تعلق، لفظ مجنوں کے مختلف معانی اور یک بیاباں کی وضاحت پوری تفصیل سے دستاویزی شواہد کے ساتھ موجود ہے۔ کوئی بھی بات بغیر دلیل کے نہیں کہی گئی ہے۔ ایک ایک شعر کی تشریح بلا مبالغہ کئی کئی صفحات پر محیط ہے۔ بڑے سے بڑے محقق یا غالب شناس کے لیے یہ رواں پروجیکٹ ایک مثالی نمونہ اور چیلنج ہے۔

پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ کی کولمبیا یونیورسٹی کی ویب سائٹ سے غالبؔ کے ساتھ ساتھ ان کے جن کاموں کو ادارہ جاتی حیثیت حاصل ہوئی ان میں میر تقی میرؔ کی غزلیات کے انگریزی ترجمے پر مبنی رواں پروجیکٹ A Garden of Kashmir بھی شامل ہے۔ پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ نے میں میر تقی میرؔ کے چھ دواوین سے مختلف غزلوں کو منتخب کر کے انگریزی قارئین کے لیے پیش کیا اور اس میں بھی تشریح، تحقیق وتنقید کا وہی طریقہ کار اپنایا جو اسداللہ خاں غالبؔ کے لیے مخصوص رواں پروجیکٹ A Desertful of Roses میں اختیار کیا گیا تھا۔ اردو زبان وادب کے حوالے سے یہ سب کارنامے ایسے ہیں جو علم کی دنیا میں پروفیسر فرینسس ڈبلیو پرچٹ کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

مضامین

مآخذ:

شرق شناسی: ایڈورڈ سعید ترجمہ محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان پاکستان 2012
برطانوی مستشرقین: ڈاکٹر علی جاوید اردو مجلس غالب اپارٹمنٹ دہلی 1992
ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد اول: شمس الرحمٰن فاروقی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2006
تفہیم غالب: شمس الرحمٰن فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 2006
بیانِ غالب۔ شرح دیوان غالب: آغا محمد باقر، کتابی دنیا دہلی 2006
ترجمہ: اصول ونظریات: ڈاکٹر ابو شہیم خان، عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی 2017
Annual of Urdu Studies University of Wisconsin Madison Vol 13 Year 1998...
Website:columbia.edu/itc/meal/pritchett/oofwp

☆☆☆

ڈاکٹر ابو شہیم خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔ 500032، موبائل: 7354966719

# اُردو و ہندی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا اظہار

اس حقیقت کے اعتراف اور اظہار کے بعد کہ خدا موجود ہے، کوئی جواز نہیں رہتا کہ اُس کی طرف سے منتخب انسانوں پر نازل احکام وقوانین یا بصورتِ دیگر الہام والقا کا انکار کیا جائے۔ تمام کائنات کی حرکت اور گردشِ لیل ونہار کا محور انسانی ذات کی بقا اور دنیا میں اس کا قیام ہے۔ نتیجتاً انسانی زندگی، اس کی تعمیر وترقی اور بہتر انجام کے عظیم مقصد میں جو بھی کام اور بات معاون و مددگار ہے، وہ عظمت کی حامل اور لائقِ توجہ ہے۔ اسی فکر کی بنیاد پر برگزیدہ اور منتخب افراد نے انسانی سماج میں امن، لوگوں کے بیچ بھائی چارے اور آپسی محبت ومؤدّت کی تعمیر وتشکیل کے لیے کبھی "خدا کے فرستادہ" کی شکل میں تو کبھی "نیست پیغمبر و لے دارد کتاب" کی صورت میں اِس مہمِ عظمیٰ کو انجام دیا۔

تصوف اور بھگتی تحریک دونوں میں ذاتِ باری تعالیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے، اس کی صفتِ رحمت و رأفت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر امن ومحبت کا بندہ ہے۔ مشہور ہے کہ محبت سے جانور بھی رام ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا وحکما نے خوفِ خدا کے بجائے حبِّ خدا کا سہارا لیا، اور اس راستے سے انسانوں کو حیاتِ دنیوی اور عالمِ اُخروی کو بہتر بنانے کی ترغیب دی۔ یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ انسانوں میں مظاہر پر توجہ (React) کا مادّہ خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔ غیبی قوت کے اعتراف کے سلسلے میں بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ عموماً اس کے لیے دکھائی دینے والی چیزوں کا سہارا لیا گیا۔ یونانی، مصری یا ہندوستانی اکثر تہذیبوں میں "غیبی قوت" کو کسی نہ کسی مظہر سے منسوب کیا گیا اور پھر اس کی عبادت کا سلسلہ شروع ہوا۔ خدا کو حسّی طور پر پانے کی خواہش نے بت پرستی یا مظاہر پرستی کے ذرائع اپنائے۔

تصوف اپنی فکری بنیادیں شریعت سے اختیار کرتا ہے۔ تصوف کا دائرہ غیر معمولی لچک کا حامل ہے، وہ معبود و غیر معبود سبھی سے خطاب کرتا ہے، سبھی کو فائدہ پہونچانا چاہتا ہے، سبھی کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہے۔ مرزا صفدر علی بیگ کتاب تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری میں لکھتے ہیں:

"تصوّف کی بنیادیں قرآنِ حکیم اور سنّتِ رسولؐ پر قائم ہیں جن کے بغیر اس کو نہیں سمجھا جاسکتا لیکن اس کے مباحث، مسائل، تصوّرات اور صوفیانہ طرزِ زندگی تقریباً وہی ہے جو دوسرے مذاہب اور اُن کے پیروؤں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے اِس خاص شعبۂ علم کو انگریزی میں "مسٹیسیزم" Mysticism کہا جاتا ہے۔ لیکن لفظ مسٹیسیزم کا اردو ترجمہ تصوف نہیں ہے جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ لفظ مسٹیسیزم دراصل یونانی زبان کے لفظ مسٹیریان Mysterion سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''مخفی رسومِ مذہبی'' Secret Religious

مضامین

Ceremony خود مسٹیریان کا لفظ "میو" Myo سے بنا ہے جس کے معنی ہیں "پراسرار اور پوشیدہ رہنا" to be mysterious اس لحاظ سے مسٹیسیزم کا لفظی ترجمہ سرّیت" ہونا چاہئے نہ کہ تصوف۔ تصوف کا لفظ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، چند خاص معنوں میں اور صرف اسلامی افکار و تعلیمات کے ایک خاص شعبے کے لئے اسلام کی اشاعت کے بعد مستعمل ہوا۔ آغازِ اسلام سے پہلے یونانی، عیسائی اور نوفلاطونی سرّیت کے لئے تصوف کے لفظ استعمال نہیں ہوا۔ تصوف کو انگریزی زبان میں "اسلامک مسٹیسیزم" یا "صوفی ازم" Sufism کہا جاتا ہے۔"(1)

یوں تو تصوف ایک نظریہ یا تصور تھا لیکن مرورِ ایام کے ساتھ اس میں اتنے مباحث در آئے کہ یہ فلسفہ لگنے لگا۔ فلسفہ کسی مفروضے پر قائم ہوتا ہے، اس لحاظ سے تصوف کو فلسفہ نہیں، ہاں اسلامی تشریح پر مبنی ہونے کی وجہ سے ایک اسکول یا مکتبۂ فکر کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں۔ تصوف نظری و عملی دونوں مباحث پر مشتمل ہے یعنی انسان کے فکر و عمل دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ صفدر علی بیگ نے تصوف کے بنیادی مباحث و مسائل کو حسب ذیل موضوعات کے تحت درجہ بند کیا ہے:

۱۔ وجودِ باری تعالیٰ جس کے ضمن میں (ا) مسئلۂ وحدۃ الوجود یا توحیدِ وجودی (ب) مسئلۂ وحدۃ الشہود یا توحیدِ شہودی اور (ج) غیریت یا دوئی پر بحث کی جاتی ہے۔

۲۔ فلسفۂ حسن و عشق جس میں حقیقتِ حسن و عشق اور مجاز و حقیقت، فنا و بقا، عقل اور عشق اور انجامِ عشق پر بحث ہوتی ہے۔

۳۔ صوفیانہ اخلاق جس میں نفسِ انسانی و خواہشات اور فقر و غنا پر بحث کی جاتی ہے۔

۴۔ انسانی اعمال جس میں مسائلِ خیر و شر، جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر اور انسان کے مقام پر بحث ہوتی ہے۔

۵۔ دنیوی زندگی کی حقیقت پر بحث ہوتی ہے اور اس کی ناپائیداری پر عبرت و نصیحت کی تلقین کی جاتی ہے۔

۶۔ تصوف اور صوفیت کے ضمن میں اہلِ طریقت اور اہلِ شریعت کے تصورات، عقائد اور اعمال و افعال کا جائزہ لیا جاتا ہے اور دونوں کے باہمی تنازعہ پر بحث کی جاتی ہے۔

۷۔ صوفیانہ اور روحانی تجربات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۸۔ صوفیانہ اشارات اور اصطلاحات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔(2)

مرزا صفدر علی بیگ کی کتاب تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری پر اپنی 'تمہید' میں سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

"اردو میں ٹھیٹ صوفی شعراء کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں لیکن شاعرانہ تصوف کس کے ہاں نہیں ملتا۔ چنانچہ ایسے شعراء کے کلام میں بھی جنھیں مذہب اور تصوف سے کم تعلق رہا ہے، تلاش کرنے والوں نے تصوف کو تلاش کر ہی لیا۔ کسی زمانے میں زندگی اور ادب دونوں میں تصوف کا رنگ گہرا اور واضح تھا لیکن بدلے اور بدلتے ہوئے معاشرتی حالات میں اس کا اثر کم ہوتا جارہا ہے، تاہم یہ رنگ ہے اور رہے گا۔"(3)

مضامین

منتخب اُردو اشعار:

(۱) خدا کا اعتراف اور وحدۃ الوجود کا تصور

مسئلۂ وحدۃ الوجود فلسفہ و تصوف کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اس کے متعدد مباحث ہیں مثلاً؛ تنزیہ و تشبیہ، وحدت و کثرت، ظاہر و باطن میں خدا کی جلوہ گری، ذات و صفات اور عینیت و غیریت وغیرہ۔ رواجِ زمانہ اور مضمون کی شہرت و عمومیت کے چلتے تصوف کا پہلو بہت سارے اردو شعرا کے یہاں مل جاتا ہے۔ البتہ تصوف کے مسائل و مباحث کو اس کی باریکیوں اور نزاکتوں کے ساتھ پیش کرنے والے شعرا کی تعداد معدودے چند ہے۔ وحدۃ الوجود کے تصور کے بارے میں مرزا صفدر علی بیگ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"توحیدِ وجودی کا اصل تصور یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہر شے کی اصل، ہر شے پر محیط اور ہر شے کی حقیقت ہے۔ وہی تمام کائنات کے اندر اور اس سے باہر ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا تمام مظاہر میں ظہور ہے۔ وہ کائناتِ رنگ و نور کی تمام اشکال میں جلوہ گر ہے۔"(4)

**میراں جی شمس العشاق:**

نا اُس روپ نا اُس دیکھنا نا اُس تھان مکان
نرگُنا گُنونتا کروا کس مُکھ بکھان!!!!!(5)

نِرگُن: جس کی شکل نہ ہو، گُنونتا: شکل دینے والا، بکھان: ذکر

**برہان الدین جانم:**

لامکاں میں اُس کا ٹہار
دُسرا نہیں واں کوئی بچار
بن روپ اچھون بن مکان
نا منجھ مانند کوئی نشان

بچار: سمجھ لے، اچھون: رہتا ہے

**قاضی محمود بحری:**

اے روپ ترا اَتی اَتی ہے
پربت پربت پتی پتی ہے
سب تجھ میں اگر کہے تو سچ ہے
جون جل کے منجھار مچ ہے مچ ہے

اَتی اَتی: مرزا نے اس کا مطلب رَتّی رَتّی کیا ہے، جب کہ اَتی کے معنی بہت، بہت زیادہ، غلبہ کے ہیں۔ مچ: مچھلی

**خواجہ میر درد:**

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا

**اصغر گونڈوی:**

پردۂ دہر کچھ نہیں ایک ادائے شوخ ہے
خاک اٹھا کے ڈال دی دیدۂ امتیاز میں

(6)

(۲) وَفِی انفسھم افلا یبصرون

خدا اور انسان کے بیچ ربط و تعلق اور عبد و معبود کا رشتہ تصوّف کے کبارِ مسائل میں سے ہے۔ یہ حیرانی کی بات نہ ہونی چاہیے کہ شعرا اپنے ہنر و فن کی معیار بندی، یُمن و تبریک کے لیے کسی غیبی قوت کی فیض بخشی و انعام دہی کا اقرار و اظہار کرتے رہے ہیں۔ اردو کے قدیم شعرا کی تصنیفات

مضامین

اس کی مثالوں سے پُر ہیں۔(7) یہ ایک خاص باب میں خدائی توجہ وکرم کی بات تھی، ورنہ نفس انسان وخدا کے تعلق سے بھی متعدد شعرا نے اشعار رقم کیے ہیں۔تصوف کے رنگ میں رنگے اِن اشعار کے پیچھے وہی باتیں رہیں، جو باتیں خود اِن صوفیانہ خیالات کی بنیاد تھیں۔ مثلاً قرآن کی آیت "ونَحنُ اَقرَبُ اِلیه مِن حبلِ الوَرِید "،"وَنَفَختُ فِیهِ مِن رُّوحِی "یا حضرت علی کی طرف منسوب یہ قول "مَن عَرَفَ نَفسَهُ عَرَفَ رَبَّهُ" وغیرہ۔

**برہان الدین جانم:**

تجھ میں داخل اچھے یوں
وہ تجھ بن خارج دِستا کیوں
نور کوں روح کردیتا نانوں
روح ہو، تن میں پکڑیا ٹھانوں

**میرانجی شمس العشاق:**

تجھ میں رہیا یوں مل جائے
جوں پانی میں باوٗ سمائے

**ولی دکنی:**

سجن کے باج عالم میں دگر نئیں
ہمیں میں ہے، ولے ہم کو خبر نئیں

**خواجہ میر درد:**

دونوں جگہ میں معنیٔ مولا ہے جلوہ گر
غافل ایاز کون ہے، محمود کون ہے

ooo

**میر تقی میر:**

اپنی ہی سَیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

**امجد:**

دونوں موجود، کوئی معدوم نہیں
دونوں ہیں یقینی، کوئی موہوم نہیں
ہے ایک وجود، باوجودِ مَن و تُو
تو مجھ میں ہے، مَیں تجھ میں ہوں معلوم نہیں

**منتخب ہندی اشعار:**

**(۱) مخلوق سے محبت:**

بھگتی تحریک کا مرکزی خیال حُبِّ خدا اور حُبِ انسان ہے۔البتہ ترتیب اس کی یہ ہے کہ حبِ انسان سے حبِ خدا حاصل ہوتی ہے۔عبدالرحیم خان خاناں کہتا ہے:

رحمٰن دھاگا پریم کا متی تورو چٹکائے
ٹوٹے پُنی نا ملے، ملے گانٹھ پری جائے

(8)

**(۲) وَفِی اَنفُسِھِم اَفَلا تُبصِرُون**

**کبیر:**

جیوں تل ماھیں تیل ھے جیوں چکمک میں آگ
تیرا پریتم تجھ میں، جاگ سکے تو جاگ

(9)

**(۳) صفائیٔ قلب**

یہ کب ممکن ہوگا کہ انسان اپنے اندر بسنے والے

صاحب کے وجود کو پہچانے اور دیکھے؟ جو بات مضمون (۲) میں کہی جارہی ہے، اس کے لیے شرط ہے کہ دل کا آئینہ صاف ہو۔ اگر دل پر کثافت ہے تو اس میں موجود تصویر نظر نہیں آسکتی۔ کبیر ہی کہتے ہیں:

ھردے ماھیں آرسی مکھ دیکھا ناھیں جائے
مکھ تو تبَ ھی دیکھ، جب دل کی دُرمَتِ جائے
(10)

**دُرمَت: کثافت، گندگی:**

**(۴) صورت نہ کہ سیرت:**

یہ تصوف اور بھگتی تحریک کا ایک پامال موضوع ہے۔ عام اخلاقی تلقین یہی ہے کہ کسی کو اس کی ظاہری صورت کے آئینے میں نہیں بلکہ سیرت کے سانچے میں ناپنا چاہیے۔ دادودیال کہتے ہیں:

جات نہ پوچھو سادھو کی پوچھ لیجئے گیان
مول کرو تلوار کا پڑن رھن دو میان
(11)

**(۵) بے ثباتیِ دنیا:** سہجو بائی کہتی ہیں:

چلنا ھے رھنا نہیں، چلنا بسوے بیس
سہجو تنک سہاگ پر کیا گندھوائے سیس
(12)

## حواشی و توضیحات:

1۔ مرزا صفدر علی بیگ، تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری، علمی انجمن سوئی والان، دہلی۔ ۱۹۸۶ء، صفحہ ۵۲

2. ایضاً، صفحہ ۸۲-۹۲

3. ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، 'تمہید' تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری

4. تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری، صفحہ ۲۵

5. اس موضوع سے متعلق اردو شعرا کے تمام اشعار مرزا صفدر علی بیگ کی کتاب تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری سے لیے گئے ہیں۔

6. مذکورہ شعرا کیعلاوہ بھی متعدد شعرا نے اس پہلو پر شعر کہے ہیں۔ مثلاً اکبرالہ آبادی، اقبال، جگر مرادآبادی وغیرہ کے اشعار:

سچ ہے! کسی کی شان یہ، اے نازنیں نہیں
تو ہر جگہ ہے جلوہ گر اور پھر کہیں نہیں!!!
(اکبرالہ آبادی)

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شَے ہے، اندازِ بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے، کیا بتائے
اگر ماہی کہے، دریا کہاں ہے!!!!!
(اقبال)

ہر پردۂ ہستی میں جب تو متشکّل ہے
حیران ہوں میں جلوہ پھر کون سا باطل ہے
(جگر مرادآبادی)

7. دکنی شعرانے اس بات کا پہلو بدل بدل کر اعتراف و اظہار کیا ہے کہ اُن کی شعری صلاحیتیں خدا کی ودیعت کردہ یا کسی

مضامین

کی دعا ونظر کے واسطے غیبی قوت کا الہام ہیں۔ یہ موضوع عموماً منظومات کے ابتدائی حصوں میں آیا ہے۔ وہ شعری صلاحیت اور مضامینِ شعر کو بھی غیبی عطا مانتے ہیں۔ غواصی اپنے کلام کی تاثیر کو خدا کی عنایت کہتا ہے۔ صنعتی کا قول ہے کہ اگر قسمت ساتھ نہ ہو تو شاعری میں بات پیدا نہیں ہوسکتی، اور جس چیز کا کوئی حاصل نہ ہو، اس پر محنت رائگاں ہے۔ نصرتی کہتا ہے: اَے خدا! جس طرح بانسری سے آواز نکلتی ہے، اُسی طرح شاعر کے جی سے تیری باتوں اور حکمتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

8. ہندی ادبیات ('زمانہ' کانپور سے انتخاب)، ص۴۲، شائع کردہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء۔ محبت کی تلاش اور محبت کی تقسیم کا یہ ارادہ اہل اللہ اور صوفیا کو نفسِ انسان میں امتیازِ نیک و بد سے روکتا ہے۔ وہ سب سے ملنا اور سب کو ملانا چاہتے ہیں۔ رحیم کہتے ہیں کہ نیک فطرت کو بری صحبت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی جیسے چندن کے پیڑ پر سانپ کے لپٹنے سے زہر کا اثر نہیں ہوتا:

جو رحمٰن اُتم پرکرتی، کا کری سکت کُسنگ
چندن وش ویاپت نہیں، لپٹے رہت بھُجنگ

9. ہندی شاعری، صفحہ ۵۸۱، اعظم کریوی، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۳۹۱ء۔ کبیر نے اسی مضمون کو ایک اور جگہ اپنے مخصوص انداز میں ادا کیا ہے:

سمجھے تو گھر میں رہے، پردا پلک لگائے
تیرا صاحب تجھ میں، اَنت کہوں مت جائے

(ایضاً، ص۸۸۱)

10. ایضاً، صفحہ ۲۹

11. ایضاً، صفحہ ۲۰۲

12. ایضاً، صفحہ ۷۹۔ اعظم کریوی نے لکھا ہے کہ "یہ دوھا دھلی کے ایک مشہور بھگت چرن داس کی چیلی سجو بائی کا ھے۔" (ہندی شاعری، صفحہ ۸۹) اعظم کریوی نے سجو بائی کے صرف ایک (مذکورہ) دوھے کا ذکر کیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر جعفر حسن نے سجو بائی کے کچھ اور دوھے تلاش کر کے لکھے ہیں، جس سے شاعرہ کے موضوعِ شاعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، لوگوں کی بے مروتی، انسان کی بے بسی اور تنہائی کے موضوع کو نہایت پر درد اور فطری انداز میں باندھا ہے۔ ایک اور دوھا:

تُلسی تینوں لوک میں گُو جانے پَر پیر
یا جانے من آپنا یا جانے رگھوبیر

پَر: پرایا، پیر: درد، تکلیف، رگھوبیر: خدا، مالک (منتخباتِ ہندی کلام، صفحہ ۲۹، مرتبہ جعفر حسن، حیدرآباد بک ڈپو، حیدرآباد، ۱۹۳۰ء)

☆☆☆

محمد مبین آصف
ریسرچ اسکالر
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

مضامین

# حیدرآباد میں اردو صحافت کے نقوش

ہندوستان کی سرزمین میں جنوبی ہند کے مرکز کی حیثیت سے ریاست حیدرآباد کو امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔ اس ریاست کو آصف جاہی بادشاہوں کی سرپرستی کا آغاز 1724ء میں ہوا۔ اس سے قبل اس علاقہ پر قطب شاہی بادشاہوں کی حکمرانی رہی۔ اس دور میں سلطنت گولکنڈہ کی حیثیت سے شہرت رکھنے والی قطب شاہی بادشاہت کو دکن میں بہمنی سلطنت کے توسط سے گلبرگہ اور بیدر میں قائم شدہ 1347 عیسوی سے لے کر 1527ء تک حکمران بادشاہوں نے دکن کے علاقہ کو اپنے مرکز کا درجہ دیا۔ بہمنی سلطنت کے خاتمہ کے بعد دکن میں پانچ نئی سلطنتیں عماد شاہی برار، نظام شاہی احمد نگر، عادل شاہی بیجاپور، برید شاہی بیدر اور قطب شاہی گولکنڈہ میں قائم ہوئی۔ اسی گولکنڈہ کے بادشاہوں کے توسط سے حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا اور اس علاقہ کا عالمی سطح پر شہرت رکھنے والا ''کوہِ نور'' ہیرا حیدرآباد کی شناخت اور اس شہر کو موتیوں کے شہر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ قطب شاہی آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کو مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے 1687ء میں سلطنت سے بے دخل کر دیا تو اس علاقہ پر 1687ء سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کی وفات 1707ء تک مغلوں کی حکومت رہی، جس کے بعد بھی یہ علاقہ مغلوں کے قبضہ میں رہا۔ نظام الملک آصف جاہ اول میر قمرالدین علی خاں نے مغلیہ سلطنت کی کمزوری پر توجہ دیتے ہوئے 1724ء میں اورنگ آباد کو پایہ تخت بنا کر آصف جاہی سلطنت کی بنیاد رکھی، جس کے سات بادشاہ گذرے۔ آخری بادشاہ نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں 1948ء کے دوران انڈین یونین کی فوجوں نے حیدرآباد پر حملہ کیا اور سقوط حیدرآباد کے نتیجہ میں آصف جاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ریاستِ حیدرآباد ایک وسیع اور فلاحی حکومت سے وابستہ تھی، اس لئے اس علاقہ میں بادشاہوں کی سرپرستی اور عوامی دلچسپی کی وجہ سے باضابطہ صحافت کا آغاز ہوا۔ اس علاقہ میں صحافت کے آزاد اور اخبارات کے توسط سے پیش ہونے والی سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی جیسے دکنی ادب کے مورخ ہی نہیں، بلکہ مختلف ادیبوں نے حیدرآباد کی اردو صحافت پر اظہارِ خیال کیا ہے جس کی نمائندگی کرتے ہوئے سید ممتاز مہدی نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

ہندوستان میں صدیوں سے اخبار اور وقایع نگاری کا دستور تھا جو سرکاری حیثیت رکھتے تھے اور بادشاہِ وقت کے ملاحظہ میں پیش ہوتے تھے یا بادشاہ کے روزنامچہ وغیرہ کی اطلاع دوسرے والیانِ ریاست اور صوبہ داروں کو دی

مضامین

جاتی تھی لیکن موجودہ طرز کے اخباروں کا آغاز انگریزی دورِ حکومت میں ہوا۔ ہندوستان کا پہلا انگریزی اخبار بنگال گزٹ تھا جو 1780ء میں شائع ہوا۔ حیدرآباد کا پہلا اخبار ''دکن ٹائمس'' تھا جو 1864ء سے 1891ء تک جاری رہا۔کوئی عبدالقادر اس کے ایڈیٹر تھے۔

اردو اخباروں میں سب سے پہلا اخبار جو ہفتہ وار تھا 1878ء میں ''آف الاخبار'' کے نام سے شائع ہوا اس کے ایڈیٹر نارائن راؤ تھے اور پہلا اردو روزنامہ اخبار ''ہزار داستان'' تھا جو 1883ء میں شائع ہوا۔اس کے ایڈیٹر محمد سلطان عاقل تھے۔

1900ء تک جاری ہونے والے اردو اخبارات حسب ذیل ہیں:

(۱) پیک آصفی 1884ء مدیر سید حسن
(۲) سفیر دکن 1888ء مدیر سید امجد علی
(۳) مشیر دکن 1899ء مدیر کشن راؤ

صحافت کی جس روش کو پیش نظر رکھ کر اس باب میں اخبارات کی تفصیلات درج کی جارہی ہیں، درحقیقت اس عمل کو اخباری صحافت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی صحافت بھی کارکرد ہوتی ہے۔ چونکہ تحقیقی مقالہ کا موضوع ''حیدرآباد کے نامور صحافیوں کی ادبی و صحافتی خدمات (آزادی کے بعد)'' سے متعلق ہے، تو اس پس منظر میں سب سے پہلے صحافتی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے کے لئے اخبارات اور ان کے توسط سے حیدرآباد کی سرزمین میں پیش ہونے والی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے تین اخبارات کے ذریعہ حیدرآبادی صحافت کی بنیاد مستحکم ہونے کی تفصیلات درج کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اردو صحافت کا آغاز 1883ء سے ہوا۔ چنانچہ پہلا روزنامہ ''ہزار داستاں'' قرار دیا جاتا ہے، جس کے ایڈیٹر نارائن راؤ تھے، جس کے بعد وقفہ وقفہ سے حیدرآباد کی سرزمین میں اخباری صحافت کی بنیاد رکھنے والے تین اہم مدیران کا ذکر اور ان کے اخبارات کی تاریخ لکھ کر یہ بتایا جارہا ہے کہ حیدرآباد کی صحافت کا سلسلہ انگریزی صحافت کے تین سال بعد شروع ہوا۔ ہندوستان کا پہلا انگریزی اخبار ''بنگال گزٹ'' کی اشاعت 1780ء میں ہوئی، جبکہ حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز 1883ء کی یادگار ہے جو محمد سلطان عاقل کے زیرادارت شائع ہوتا تھا۔ غرض حیدرآباد میں اخباری صحافت کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے دیگر حقائق اس طرح سے پیش کئے گئے ہیں۔

ناز انصاری اپنے مضمون ''اردو صحافت ایک جائزہ'' میں رقم طراز ہیں:

**''پیک آصفی:** حیدرآباد دکن سے مولوی سعید احمد زید بلگرامی نے پہلا روزنامہ جنوری 1884ء میں شروع کیا۔ان کا ایک ہفت روزہ ''ہزار داستان'' تھا۔

**مشیر دکن:** 1887ء میں پنڈت کشن راؤ نے ''دکن پنچ'' شروع کیا۔ پانچ سال بعد اسے مشیر دکن کا

نام دے کر روزنامہ کردیا۔

یوروپی دنیا سے اردو صحافت کا سفر جب ہندوستان میں ہوا تو سب سے پہلے انگریزوں نے بنگال سے اخباری دنیا کی روایت شروع کی۔ حیدرآباد کی سرزمین سے شائع ہونے والا پہلا اخبار ''دکن ٹائمس'' 1864ء میں جاری ہوا اور 1891ء تک اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر عبدالقادر تھے۔ حیدرآباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس سرزمین سے نہ صرف انگریزی اور اردو روزنامے شائع ہوئے بلکہ دیگر زبانوں کے اخبارات کی روایات بھی جاری و ساری رہیں۔ چونکہ مقالہ کے موضوع کا تعلق اردو صحافت سے ہے اس لئے حیدرآباد کی اردو صحافت کے پس منظر میں ان اخبارات کا ذکر کیا جارہا ہے جو حیدرآباد کی سرزمین سے قدیم دور کی نمائندگی کرنے اور اپنی خصوصیات کو پیش کرنے کے حامل قرار دیئے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیلات ملاحظہ ہوں:

**(۱) ہزار داستان:** ماہ ربیع الاول 1301ھ م 1883ء سے زبان اردو میں زیرادارت مولوی محمد سلطان عاقل دہلوی روزآنہ شائع ہونا شروع ہوا۔ عوام خریداروں سے بارہ روپیہ سالانہ چندہ لیا جاتا تھا۔ یہ مستقر حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ ماہ ربیع الثانی 1305ھ م 1887ء سے بند ہوگیا۔

**(۲) اخبار آصفی:** ماہ ذی الحجہ 1301م 1883ء سے بڑی تقطیع پر زرد رنگ کے کاغذ پر زیرنگرانی مولوی سید محمد سلطان عاقل دہلوی متصل پرانی حویلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ چندہ سالانہ سات روپیہ مقرر تھا۔ یکم جنوری 1887ء سے اخبار مذکورہ انگریزی مہینے کی 7، 14، 21، اور 28 تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس میں علمی اور اخلاقی مضامین ہوا کرتے تھے۔ اس کی اشاعت کا سلسلہ چند سال تک جاری رہا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا یہ کس سنہ میں بند ہوا۔

**(۳) افسرالاخبار:** 7 محرم 1304ھ م 1886ء سے بڑی تقطیع پر بہ سرپرستی نواب کرنل افسرالملک بہادر قلعہ گولکنڈہ سے شائع ہوتا تھا۔ زبان اردو تھی چند ہی سال میں بند ہوگیا۔

**(۴) اخبار سفیر دکن:** وسط ماہ ذیقعدہ 1305ھ م 1887ء میں زیرایڈیٹری مولوی سید امجد علی شہری بڑی تقطیع پر چادر گھاٹ رزیڈنسی بازار سے روزانہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مالک مولوی محمد ذکی الدین وظیفہ یاب تعلق دار تھے۔ اخبار مذکور سیاسی اخبارات کو شخصی حکومت میں زیادہ دن تک زندہ رہنے کا حق کیسے ہوسکتا تھا۔ چنانچہ چند سال جاری رہ کر موقوف ہوگیا یا حکومت کی جانب سے بند کردیا گیا اس کا صحیح علم نہ ہوسکا۔

☆☆☆

محمد ناہید علی
ریسرچ اسکالر تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد

مضامین

# ہندوستان میں تعلیمی مساوات اور ایکویٹی: ایک مطالعہ

ہندوستان مختلف تہذیب وثقافت کا عظیم گہوارہ ہے جہاں کثیر مذاہب وعقائد کے ماننے والے افراد اخوت ومحبت، اتحاد واتفاق، عدل وانصاف اور اچھے اخلاق وکردار کے ساتھ رہتے ہیں۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ''ہمارا ملک ہندوستان مختلف قسم کے مذاہب، عقیدے، برادری، اور ثقافت سے بھرا ہوا ہے اور یہاں کے تمام مذہب، ثقافت اور افکار کے لوگ ایک ہی برادری اور ایک ہی علاقے میں پرامن طریقے سے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تنوع میں اتحاد ہے''۔

آئین ہند نے ملک کے تمام باشندوں کو انصاف، آزادی، مساوات، اتحاد وسالمیت اور بھائی چارگی کا حق فراہم کیا ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں سماجی اور معاشی عدم مساوات تشویش کا باعث ہے اسی لئے تعلیمی سہولیات کو مساوات اور مساوات کو یکسانیت (ایکویٹی) کے ساتھ جوڑنا ضروری ہے۔ تعلیم ایک ایسا موثر ذریعہ ہے جس کے ذریعے کوئی بھی معاشرہ سماجی مساوات کے لیے کوشش کرسکتا ہے۔ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ تعلیم انسان کو مختلف زاوے سے سوچنے سمجھنے اور درپیش مسائل کا بہترین حل نکالنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے۔ انسان کو سماج کے تئیں ہمدردی اور سماجی مسائل، معاشی مسائل، تعلیمی مسائل کے حل نکالنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

**تعلیم میں مساوات کے معنی ومفہوم:** Equality means to behave everyone equally.

یعنی ہر فرد کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا۔ بغیر تفریق مذہب وملت، رنگ ونسل، غربت وافلاس کے ایک کمرہ جماعت میں ہر ایک کو برابر علم ومعلومات فراہم کرنا۔ مثال کے طور پر اسکول کے ایک ہی کمرہ جماعت میں مختلف تہذیب وثقافت، امیر وغریب، معزور وصحیح سالم، ذہین، متوسط اور ادنی درجے کے طلبہ وطالبات کو برابر تعلیم فراہم کرنا مساوات کہلاتا ہے۔ مساوات کو اس مثال کے ذریعہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک انسان کے پاس پانچ سو روپے ہیں اور اس کے پانچ بیٹے ہیں۔ پانچ سو روپے کو ہر ایک بیٹے کو سو سو روپے برابر تقسیم کردینا مساوات ہے۔

**تعلیم میں ایکویٹی کے معنی ومفہوم:** Equity is the provision of personalized resources need for all individuals to reach common goals.

ایکویٹی ایک ذاتی وسائل کی فراہمی ہے جو تمام افراد کو مشترکہ مقاصد تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ ایکویٹی کا مفہوم یہ ہے کہ مختلف طلباء کو اپنے ساتھیوں کی طرح اہداف کو حاصل کرنے کے لیے مختلف وسائل کی ضرورت کی فراہمی۔ مثال کے طور پر ایک کمرہ جماعت میں کچھ بچے ذہنی طور پر معذور ہیں وہ ذہین اور متوسط بچوں کے برابر نہیں سیکھ سکتے تو ایسی صورت میں اساتذہ معذور بچوں پر خصوصی توجہ دیں اور ان کی ضرورت کو دھیان میں رکھتے ہوئے تدریسی عمل اور تدریسی اشیاء کا مناسب استعمال کریں تو معذور بچے بھی ذہین بچوں کے برابر سیکھ سکیں گے۔ معذور بچوں کی ضرورت کے مطابق تدریسی حکمت عملی اور تدریسی اشیاء کا استعمال کرنا ہی ایکویٹی کہلاتا ہے۔

**تعلیم میں مساوات اور ایکویٹی کا پس منظر:**

تعلیم میں مساوات کا لفظ فرانس سے آیا ہے۔ 1974 میں ہندوستان نے اس لفظ کو اپنی تعلیم میں شامل کیا ہے۔ مساوات (equality) سے مراد (uniformity) نہیں ہے۔ مساوات سے مراد یہ نہیں ہے کہ سبھی لوگ سبھی طرح سے ایک جیسے ہوں۔ یہاں مساوات سے مراد مواقع کی مساوات سے ہے۔ حکومت کی طرف سے سب کو ایک جیسا سمجھا جائے۔ رنگ، ذات، مذہب اور نسل کی بنیاد پر تفریق نہ کی جائے۔ کسی مخصوص سماج کو مخصوص مواقع نہ دیئے جائیں۔ مساوات سے مراد ایسے حالات کی تعمیر کرنا ہے جس کی بنیاد پر سبھی کو اپنی

شخصیت کی نشوونما کرنے کے مساوی مواقع حاصل ہوسکیں اور سبھی کی ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوسکیں۔ جیسے تعلیم کے شعبے میں ابتدائی سطح پر بغیر کسی تفریق کے ایک متعین مدت تک مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام دفعہ 45 کے تحت کیا گیا ہے۔ ثانوی سطح پر اس سے مراد ان مختلف نصاب سے ہے جن کے ذریعے سبھی افراد کی دلچسپیوں اور ضروریات کی تکمیل کی جاسکے اور اعلیٰ سطح پر اس سے مراد ان سبھی لوگوں کے لئے تعلیمی مواقع فراہم کرنا ہے جو اس سے فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مشہور ماہر سیاسیات پروفیسر لسکی کے مطابق "مساوات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر ایک فرد کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جائے یا سبھی کو یکساں تنخواہ دی جائے۔ اگر ایک پتھر ڈھونڈنے والے کی تنخواہ ایک مشہور ماہر ریاضی یا سائنس داں کے مساوی کردی جائے، تو اس سے سماج کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ اس لئے مساوات کا مطلب یہ ہے کہ سب کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں"۔ 1779 میں تھامس جیفرسن نے ایک نصاب تعلیم تشکیل دیا جس میں یہ تجویز پیش کی کہ کلاسیکی سائنس اور تعلیم کا علم معاشرے کے تعاون کرنے والے ارکان پیدا کریں گے جس سے عوام کو فائدہ پہنچے گا۔ انہوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ تمام لوگوں کو اعلیٰ معیار کے شہری بننے کے لیے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے نصاب تعلیم کی تشکیل میں تعلیم میں یکسانیت (ایکویٹی) کا حصہ نہیں ڈالا تعلیم میں خواتین کو نظر انداز کیا اور تعلیم میں افریقی امریکیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ جس کا تعلیم اور تعلیمی اداروں پر گہرا منفی اثر پڑا۔ منفی اثرات کو دیکھتے ہوئے جن چیزوں کو نظر انداز کیا تھا اس کو شامل کرنا پڑا۔ ہندوستانی نصاب تعلیم کے تشکیل دہندگان نے اپنے ملک کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے ماضی کے نصاب تعلیم پر پڑنے والے منفی اثرات اور بگڑتے حالات وواقعات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ماضی کے نصاب تعلیم کے مطالعہ کا اثر ہی ہے کہ تعلیم میں یکسانیت (ایکویٹی) کی پیش رفت کی جارہی ہے۔

## تعلیم میں مواقع کی مساوات:

دنیا میں جتنی بھی ترقی یافتہ ممالک ہیں ہر ایک نے تعلیم کو ہر فرد پر لازم کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کی تعمیر وترقی تعلیم پر ہی منحصر ہوتی ہے جس ملک کے افراد جتنے تعلیم یافتہ ہوں اس ملک کی معاشی، سیاسی اور سماجی صورت حال اتنی ہی بہتر ہوں گی۔ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ آج کی ترقی یافتہ ممالک تعلیم کو سرمایہ کاری کے طور پر استعمال کررہی ہیں اور یہ تحریک موجودہ دور میں ترقی پذیر ممالک میں بھی شروع ہوچکی ہیں۔ آئین ہند میں شہریوں کے مساوی حقوق اور فرائض کی تفصیل سے وضاحت کی ہیں۔

آئین کے دفعہ (۲) ۹۲ میں یہ بالکل واضح کردیا ہے کہ ''حکومت سے پرورش شدہ حکومت سے امداد یافتہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں کسی بھی شہری کو مذہب، ملت، نسل، ذات، زبان اور رہائش میں سے کسی کی بنیاد پر تعلیمی اداروں میں داخلہ سے نہیں روکا جائے گا''۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر بچے، جوان، بوڑھے، مرد وزن کو مساوی مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

## تعلیم میں مساوات اور ایکویٹی کی ضرورت واہمیت:

پہلی نظر میں مساوات اور ایکویٹی کے خیالات کافی ایک جیسے لگ سکتے ہیں۔ مساوات اور ایکویٹی انصاف کے بارے میں ہیں۔ تاہم جب کہ دونوں اصطلاحات پر غور نہ کیا جائے تو دونوں تقریباً ایک جیسی لگتی ہیں، مساوات اور ایکویٹی کے اصل کافی مختلف معنی ہیں۔ ماہرین تعلیم پہلے سے ہی جانتے ہیں کہ جب پالیسی کے فیصلوں اور تعلیمی قانون سازی کی بات آتی ہے تو مساوات اور ایکویٹی کے درمیان فرق انتہائی اہم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آج کے کلاس رومز میں مساوات اور برابری (ایکویٹی) دونوں ضروری ہیں۔ بنیادی سطح پر تعلیم یکساں ہونی چاہیے۔ اور پھر تعلیم میں ایکویٹی کو شامل کرنا چاہیے تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ تمام طلباء کو وہ تعلیم مل رہی ہے جس کی انہیں مثبت نتائج کے لیے

ضروری ہے۔ بنیادی طور پر، تعلیم میں مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ہر طالب علم کو یکساں وسائل اور مواقع حاصل ہوں۔ تمام اسکولوں کے لیے یکساں فنڈنگ، یکساں معیار، مواد و سہولیات کی کثرت فراہم ہوں۔ اگرچہ ایکویٹی کا مطلب یہ ہے کہ ہر طالب علم کو اس قسم کے مواقع اور وسائل فراہم کئے جائیں جن کی انہیں اپنی مخصوص صورتحال کے لحاظ سے ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی طالب علم کو سیکھنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثال کے طور پر اس طالب علم کو ممکنہ طور پر اس طالب علم کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور ذاتی نوعیت کی ہدایات کی ضرورت ہوتی ہے جسے سیکھنے میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ معذور طلباء کو مخصوص رہائش کی ضرورت ہوتی ہے، اور جن طلباء کو اب تک ایک جیسے مواقع نہیں ملے ہیں انہیں دوسرے طلباء کے ساتھ ٹریک پر چلنے کے لئے خصوصی مدد کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ان ضرورت مند طلبا کو مخصوص مدد کی فراہمی ضروری ہوتی ہے جو ایکویٹی کی شکل میں پوری ہوتی ہے۔

**تعلیمی مساوات اور ایکویٹی کے فروغ میں تعلیمی کمیشن کی شفارشات:**

آزاد بھارت میں جو بھی تعلیمی کمیشن، تعلیمی کمیٹی، تعلیمی پالیسی اور این سی ایف بنی ہیں سب نے تعلیم میں مساوات اور ایکویٹی کی باتیں کہی ہیں اور باضابطہ طور پر اس کے نفاذ کے لیے حکومت ہند سے سفارشیں بھی کی ہیں۔ ذیل میں چند سفارشات مرکوز ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ابتدائی تعلیم سبھی اسکولوں میں مفت فراہم کی جائے۔

۲۔ ثانوی تعلیم کو جلد از جلد مفت بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے ایک مرحلہ وار پروگرام بنایا جائے۔

۳۔ آئندہ دس سالوں میں اعلیٰ ثانوی اور یونیورسٹی تعلیم میں فیس کے تعلق سے کوشش کی جانی چاہیے تاکہ سبھی ضرورت مند اور اہل طلبا کو مفت تعلیم فراہم کی جا سکے۔

۴۔ ابتدائی سطح پر درسی کتابیں اور اسٹیشنری مفت دی جائے۔ اسکولوں میں نئے داخل ہونے والے بچوں کا اسکول کی تقریب میں استقبال کیا جائے۔ دیگر بچوں کو بھی اسکول کے سالانہ امتحانات کے نتائج کا اعلان ہوتے ہی آئندہ سال کی کتابوں کا پورا سیٹ دیا جائے جس سے وہ تعطیلات کے دنوں میں آئندہ سال کی پڑھائی کر سکیں۔

۵۔ ثانوی اسکولوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کتاب بینک کا اہتمام کیا جائے۔

۶۔ ذہین طلبا کو کتابیں خریدنے کے لیے عطیات دئے جائیں۔

۷۔ تعلیم کی مختلف سطح پر ریاستی اور مرکزی حکومت کی جانب سے علمی وظائف مہیا کئے جائیں۔

۸۔ تعلیم نسواں کو فروغ دیا جائے۔

۹۔ ضرورت مند طلبا کے لیے رہائشی اسکول تعمیر کئے جائیں۔

۱۰۔ اسکولوں میں جنرل لائبریری، ہیجیٹک لائبریری قائم کئے جائیں۔

۱۱۔ خواتین کے لیے کومن روم اور سپیریٹ بیت الخلا بنائے جائیں۔

۱۲۔ طلبا و طالبات کو سماجی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تاریخی مقامات کی سیر کرائیں۔

**مساوات کے قیام کے لیے درج ذیل نکات کو فروغ:**

۱۔ ابتدائی بچپن کی تعلیم پر توجہ مرکوز کریں۔

۲۔ طلبہ کو اپنی ذاتی نوعیت کی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کریں۔

۳۔ اسکول کے انتخاب کا انتظام کریں تاکہ ایکویٹی کے خطرات پر قابو پایا جاسکے۔
۴۔ اعلیٰ ثانوی تعلیم میں، پرکشش متبادل فراہم کریں، ڈیڈ اینڈز کو ہٹادیں اور ڈراپ آؤٹ کو روکیں۔
۵۔ تعلیم سے حاصل کرنے کے دوسرے مواقع پیش کریں۔
۶۔ ان لوگوں کی شناخت کریں اور انہیں منظم مدد فراہم کریں جو اسکول میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور سال کی تکرار کو کم کرتے ہیں۔
۷۔ پسماندہ والدین کو اپنے بچوں کو سیکھنے میں مدد دینے کے لیے اسکول اور گھر کے درمیان روابط کو مضبوط بنائیں۔
۸۔ تنوع کا جواب دیں اور مرکزی دھارے کی تعلیم میں مہاجرین اور اقلیتوں کو کامیاب ہونے کا موقع فراہم کریں۔
۹۔ بنیادی اسکولنگ کو ترجیح دیتے ہوئے سب کے لیے مضبوط تعلیم فراہم کریں۔
۱۰۔ سب سے زیادہ ضروریات والے طلباء کو براہ راست وسائل کی فراہمی کریں۔
۱۱۔ مزید ایکویٹی کے لیے ٹھوس اہداف مقرر کریں خاص طور پر کم اسکولوں میں حصول اور ڈراپ آؤٹ سے متعلق غور وخوض کریں۔

**اختتامیہ:**

جس طرح تعلیم ہر فرد لیے ضروری ہے اسی طرح ہر تعلیمی اداروں کے لیے لازمی ہونا چاہیے کہ وہ کمزہ جماعت میں مساوات اور ایکویٹی کو لازم پکڑیں۔ اگر مساوات اور ایکویٹی کو لازم نہیں پکڑا گیا تو طلبا و طالبات کے مابین تعلیمی خلا پیدا ہو جائے گا جو ملک وملت کے لیے نہایت ہی خطرناک ہے۔ جو بچے ذہین وفطین ہوں گے جن کے پاس ریسورس ہوں گے وہ تعلیم میں آگے بڑھ جائیں گے اور جو ذہین نہیں ہیں جس کے پاس ریسورس نہیں ہیں وہ تعلیم میں پیچھے اور پیچھے ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر آپ ہندوستان کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں پر نظر ڈالیں تو آپ کو بڑا تعلیمی خلا دیکھنے کو ملے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں ریسورس کی کمی نظر آتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں غیر سرکاری اداروں میں ریسورس کی فراوانی ہے۔ جہاں مواقع زیادہ ملیں گے وہاں کے بچے جلدی اور زیادہ آگے بڑھیں گے۔ ساتھ ہی سرکاری تعلیمی اداروں کے کمزہ جماعت میں بھی تعلیمی خلا دیکھنے کو ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہین بچے بغیر ریسورس کے سمجھ جاتے ہیں جبکہ کمزور بچے بغیر سپورٹ کے جلدی نہیں سیکھ پاتے ہیں اور حالت ایسی ہے کہ کمزور بچوں پر نہ کما حقہ توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی ریسورس فراہم کئے جاتے ہیں۔ ہمیں سماجی ذمہ داری کو قبول کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی سماج کے مستقبل کو پروان چڑھانے کے لیے بچوں کی مدد کرنی چاہیے اور ایک تعلیمی ماحول فراہم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک استاد ہونے کی حیثیت سے بچوں کو یکساں تعلیم دیں اور جو بچے کمزور ہیں انہیں تعلیمی مدد فراہم کریں تاکہ وہ مین اسٹریم سے جڑ کر ملک وملت کا نام روشن کرسکیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اطہر حسین
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ تعلیم وتربیت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی حیدرآباد۔500032 (تلنگانہ)
موبائل : 9849253580

# معلم کی تدریسی حکمت عملیاں

نسلوں کو پروان چڑھانے کے لیے تدریس و اکتساب سے بہتر کوئی مشن نہیں ہوسکتا۔ زندگی بھر کی محنت و مشقت کے بعد اگر گنتی کے چند ہونہار شاگرد بھی قوم و ملک کے تعمیری کاموں میں لگے رہیں تو یہ ایک معلم کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوگا۔ زندگی میں چین وسکون کے لیے ایک معلم چاہے کچھ بھی کرلے، اسے اصل خوشی اپنے شاگردوں کی کامیابیوں سے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تدریس و اکتساب کو دنیا بھر میں سب سے مقدس پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ دراصل، یہ کوئی پیشہ نہیں بلکہ ایک مشن ہے، جس سے صرف طالب علموں کی کسی جماعت کو ہی نہیں بلکہ کئی نسلوں اور پورے معاشرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

تدریس و اکتساب کے ذریعہ جہاں علم کی روشنی پھیلائی جاتی ہے، وہیں اس کے ذریعہ شخصیت سازی و کردار سازی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ایک اچھا معلم اگر تہیہ کرلے تو وہ ہزاروں بچوں کا مستقبل سنوارنے میں اہم رول ادا کرسکتا ہے۔ معلم اپنے اخلاق و کردار سے بچوں میں اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ اس کی زبان و گفتگو کا کلاس روم تدریس پر راست اثر پڑتا ہے۔ تدریس دراصل کردار سازی کا کام ہے۔ اس لیے معلم کو اپنی تدریسی حکمت عملیاں طے کرتے وقت دور اندیشی سے کام لینا چاہیے۔ اگر تدریس سے پہلے کی تیاریاں مکمل ہوں تو ان سے تدریس بھی مؤثر ہوتی ہے اور خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آتے ہیں۔ مشفق و مہربان، مخلص و ہمدرد اور کام کو اپنی نجات کا وسیلہ سمجھنے والا استاذ ایسی حکمت عملیاں بناتے وقت کافی محتاط رہتا ہے۔ ایک صاحب علم معلم اپنے شاگردوں کے ذریعہ علم کی روشنی بھی پھیلاتا ہے اور قوم و ملک کے لیے ایسے شہری بھی تیار کرتا ہے جو صحت مند سماج کی تشکیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ایک مثالی معلم شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے افراد تیار کرتا ہے جن کے ذریعہ بہترین اقدار کو فروغ ملتا ہے۔

معلم ایک ماہر نفسیات اور ایک فلسفی کی طرح ہوتا ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات کے مطابق اپنا لائحہ عمل طے کرتا ہے۔ وہ بچوں کے مسئلوں کو ایک فلسفی کی طرح حل کرتا ہے۔ وہ صورت حال کے مطابق اپنی بات میں اثر ڈالتا ہے۔ معلم کو نہ صرف اپنی بات مؤثر انداز میں پیش کرنے کا فن آنا چاہیے بلکہ اس میں طلبہ کے نقطہ نظر کو غور سے سن کر اس کی اصلاح کرنے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیے۔ طالب علم کے استفسار کو غور سے سننا اور اس کا صحیح جواب دینا معلم کے روزمرہ کا کام ہے۔ اگر استاذ کی پوری بات تمام طلبہ تک نہ پہنچے یا استاذ اپنی بات ان تک بخوبی پہنچانے میں ناکام رہے تو اس سے کلاس روم تدریس کا مقصد فوت ہوسکتا ہے۔ اس لیے معلم مناسب آواز اور پرکشش انداز میں اپنی بات طلبہ تک اس طرح پہنچائے کہ تدریس کا اصل پیغام واضح ہو جائے اور تدریسی مقاصد حاصل کیے جاسکیں۔ اگر معلم کی باتیں بچوں کو سننے میں

تعلیم و روزگار

اچھی لگیں اور بچے محظوظ ہو رہے ہوں تو اس سے یہ سمجھ لینے کی بھول نہیں کرنی چاہیے کہ تدریس کامیاب ہو رہی ہے۔ تدریس کی کامیابی کا دارو مدار تدریسی مقاصد کے حصول پر ہے۔ تدریسی مقاصد حاصل ہوئے ہیں یا نہیں اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بچوں کے علم میں کتنا اضافہ ہوا اور ان کے برتاؤ میں کس طرح کی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس سلسلے میں آموزشی ماحصل پر تنقیدی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ایک ماہر استاذ کو ہمیشہ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ تدریسی مقاصد، طریقہ ہائے تدریس اور آموزشی ماحصل میں مناسب تال میل ہے یا نہیں۔ معلم جب کلاس روم میں داخل ہوتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے مؤثر تدریس اور بہتر اکتساب کی کتنی گنجائش ہے۔ جب وہ بچوں کے ساتھ تمہیدی گفتگو شروع کرتا ہے اور کلاس روم کے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہے تو مؤثر تدریس کی راہ ہموار ہونے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ طلبہ کی جھجک ختم ہونے لگتی ہے اور وہ متعلقہ سبق سے منسلک ہونے لگتے ہیں۔ معلم کے لیے ضروری ہے کہ تمہیدی گفتگو کے دوران ہی تمام طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرلے اور انہیں سبق کی طرف راغب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ اچھی تدریس اور بہتر اکتساب کا دارو مدار سبق میں بچوں کی دلچسپی قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے پر ہے۔ معلم اپنے آداب، اطوار اور گفتگو سے ہر ایک لمحہ بچوں کو اپنا پن کا احساس دلائے۔ تمہیدی گفتگو میں ایسا لفظ اور ایسا انداز بالکل نہ اپنائے جس سے کسی بچے کی توہین یا تضحیک کا خدشہ ہو۔

معلم کو چاہیے کہ وہ اپنے رویے سے تمام بچوں کو اس بات کا احساس دلائے کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے۔ معلم کی ذات سے طلبہ کو کسی قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر معلم کے کسی منفی رویہ کے سبب ایک طالب علم کی شخصیت پر منفی اثر پڑتا ہے تو یہ اس بچے کے لیے عمر بھر کا نقصان ہو سکتا ہے۔

معلم کو سب سے پہلے تدریسی مقاصد پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ یعنی متعلقہ سبق پڑھا کر وہ کون سے مقاصد حاصل کرنے والے ہیں۔ جب تک سبق کے تدریسی مقاصد طے نہیں کیے جاتے اسے کارآمد نہیں بنایا جا سکتا۔ معلم کو یہ پہلے ہی طے کر لینا چاہیے کہ مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ کون سی تدریسی حکمت عملیاں اپنانے والا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ سبق کی تدریس کے بعد کون سے نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح سبق کی اچھی منصوبہ بندی کے لیے ضروری ہے کہ معلم کی تیاری بہت اچھی ہو۔ مواد مضمون پر اچھی گرفت ہونے کے ساتھ ہی اسے مناسب طریقہ تدریس اختیار کرنے اور اکتسابی نتائج حاصل کرنے کے لیے پوری طرح چوکس ہونا چاہیے۔ ایک اچھے معلم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تدریس کو کس طرح مؤثر اور دلچسپ بنائے اور طریقہ تدریس کو آخر تک دلچسپ بنائے رکھے۔ سبق کو پڑھاتے وقت معلم کے ذہن میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ وہ اس سبق میں طلبا کو کس حد تک مصروف رکھنا چاہتا ہے۔ بہتر آموزش کے لیے وہ طلبہ سے کیسی سرگرمیاں کرانا چاہتا ہے۔ خود وہ کس طریقے سے سبق کو پیش کرنا چاہتا ہے اور ان کے پڑھانے کا

انداز کیسا ہونا چاہیے۔ وہ طلبہ کے ساتھ تمہیدی گفتگو کیسے شروع کرنا چاہتا ہے اور گفتگو کے آخری مرحلے میں وہ اپنی بات کا سلسلہ پیش نظر سبق سے کیسے قایم کرنا چاہتا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کے ذہن میں واضح ہونی چاہئیں۔ بلکہ معلم کے منصوبہ سبق میں یہ باتیں اختصار کے ساتھ لکھی ہونی چاہئیں۔ اگر تدریسی مقاصد واضح ہیں، طریقہ تدریس ان کے موافق ہے تو آموزشی ماحصل کے اطمینان بخش ہونے کا قوی امکان ہے۔

کلاس روم میں بہترین تدریس و اکتساب کے اثرات طلبہ میں یقینی طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھے معلم کی کلاس روم کی باتیں طلبہ زندگی بھر یاد رکھتے ہیں۔ معلم بھی آموزشی ماحصل پر گہری نظر رکھتے ہوئے تدریس و اکتساب کو نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح کمرہ جماعت م کی اکتسابی سرگرمیوں کو منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معلم پہلے اپنے سبق کو منظم کرلے۔ سبق میں بچوں کی دلچسپی قایم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سبق منظم ہو۔ اس سے سبق کی طرف طلبہ کی توجہ برقرار رہے گی۔ اس سے بچے نہ صرف جسمانی اور ذہنی طور پر کلاس روم میں موجود رہیں گے بلکہ سبق کو آگے بڑھانے میں معلم کو تعاون بھی دیں گے۔ بچوں کو سبق کی طرف راغب کرنے، سبق میں ان کی دلچسپی قایم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کمرہ جماعت کا ماحول سازگار ہو۔ بچوں میں سبق کے تئیں مثبت رویہ قایم کرنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ معلم کو چاہیے کہ طلبہ کی دلچسپیوں کے مطابق طریقہ تدریس اختیار کرے۔ وہ اپنے دلچسپ انداز اور شیریں گفتگو کے ذریعہ بچوں کو سبق کی طرف راغب کرے اور بہتر آموزش کے لیے کمرہ جماعت کا ماحول سازگار بنائے۔ اس کے لیے معلم کو اپنی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اسے حس مزاح کا خاطر خواہ مظاہرہ کرنے کی پوری آزادی تو ہے مگر اس بات کو بھی یقینی بنانا ہے کہ اس کا تکیہ کلام کسی بھی زاویے سے مضحکہ خیز نہ ہو۔ اگر معلم گفتگو کے دوران عادت کے طور پر کوئی لفظ بار بار بولے، تو اس سے بھی بدمزگی پیدا ہوسکتی ہے۔

معلم کو کمرہ جماعت میں نظم وضبط قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے خود کو وقت کا پابند بنانا پڑتا ہے اور تدریس کے تمام تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر طلبہ کے تئیں معلم کا رویہ ہمدردانہ ہے اور وہ خود اچھی شخصیت کا مالک ہے تو کلاس روم میں نظم وضبط قائم کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی ہے۔ معلم چونکہ نبض شناس اور تعلیمی نفسیات سے واقف ہوتا ہے اس لیے اس کے لیے اپنے طلبہ کے مزاج سے انفرادی طور پر واقفیت حاصل کرنا زیادہ مشکل کام نہیں۔ معلم کو چاہیے کہ وہ اپنے طلبہ کے مزاج سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انھیں اس لائق بنائے کہ وہ کمرہ جماعت میں قاعدے سے بیٹھنا اور اکتسابی سرگرمیوں میں حصہ لینا سیکھ جائیں۔ اگر کسی طالب علم کی طرف سے کوئی غیر متوقع حرکت سرزد ہوجائے تو معلم کو اس سے نمٹنے کا ہنر آنا چاہیے۔ وہ مختلف

حکمت عملیوں کے ذریعہ کلاس روم کو منظم اور تدریسی ماحول کو سازگار بنا سکتا ہے۔ منظم کلاس روم کے سازگار ماحول میں ہی اکتسابی نتائج توقع کے مطابق ہوتے ہیں۔

اچھے اساتذہ اپنے طلبہ کی علمی لیاقتوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ معلم کو اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ اسے اپنی تدریس کے ذریعہ طلبا میں مثبت تبدیلیاں پیدا کرنی ہیں تاکہ وہ اچھی شخصیت کے مالک بن سکیں۔ اس لیے اسے اس بات پر توجہ دینی ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ پڑھا رہا ہے اس سے طلبہ کے کردار میں کوئی مثبت تبدیلی رونما ہو رہی ہے یا نہیں۔ طلبہ کے ساتھ باہمی گفتگو کے ذریعہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر طلبہ کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے تو وہ توقع کے مطابق ہے یا اس سے کم۔ اساتذہ کو اپنے طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کا اندازہ ہونا چاہیے۔ جب بچے ایک کلاس میں کامیابی حاصل کر کے دوسری کلاس میں پہنچتے ہیں تو اگلی کلاس میں ان کے ذخیرہ الفاظ میں تیزی سے اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ہر کلاس میں بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں خاطر خواہ اضافہ ہو، درسی کتاب کی تیاری میں اس پہلو پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اگر بعض بچوں کو مخصوص قسم کے الفاظ و اصطلاحات کو سمجھنے میں دشواری ہو تو معلم کو اس کے لیے الگ حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر معلم طفل مرکوز تعلیم کے تقاضوں سے واقف ہے تو اسے اس نوعیت کے مسئلوں کا حل نکالنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

ایک کامیاب معلم اپنی زبان کی شیرینی سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ غیر معیاری زبان کا استعمال معلم کی شان کے خلاف ہے۔ خاص طور پر اردو زبان و ادب کے معلم کو معیاری اردو بولنا چاہیے۔ اگر گفتگو میں چاشنی اور لہجے میں نرمی ہو تو پھر بات بننے لگتی ہے۔ معلم کو ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ بات دل سے نکلے اور دل تک پہنچے۔ چھوٹی موٹی، عام فہم باتوں میں اثر ڈالنے کا ہنر معلم کو ضرور آنا چاہیے۔ معلم اپنے انداز گفتگو کی وجہ سے ایک بہترین شخصیت کا مالک ہو سکتا ہے۔ معلم کی شخصیت اتنی دلچسپ ہو کہ وہ اپنی باتوں سے اپنے طلبہ کو گرویدہ بنا لے۔ اگر طلبہ اپنے استاذ کی بات چیت اور ان کے انداز گفتگو سے متاثر ہیں تو سبق کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے اور بچوں کو سبق کی طرف مائل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چونکہ معلم روزانہ اپنے طلبہ کو کچھ نہ کچھ نیا سکھاتا ہے، روز انھیں کوئی نہ کوئی نئی بات بتاتا ہے اس لیے طلبہ میں جستجو رہتی ہے کہ جب استاذ محترم ان سے مخاطب ہیں تو ان کے علم میں ضرور اضافہ ہونے والا ہے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ طلبہ کی اس امید کو ہمیشہ قائم رکھے اور ان کی معلومات میں اضافہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ طلبہ کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ کلاس روم کی تمام سرگرمیاں ان کے فائدے کے لیے ہیں۔ اسی احساس کے سبب طلبہ تدریسی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ اگر معلم کو اپنے طلبہ کو متاثر کرنے کی مہارت حاصل ہے تو وہ ان کی معلومات میں اضافہ کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوگا۔ وہ معاون تدریسی اشیاء اور اطلاعاتی ٹکنالوجی کا استعمال کر کے سبق میں نئی روح

پھونک سکتا ہے۔ سبق کو مؤثر بنانے کے لیے بلیک بورڈ یا وہائٹ بورڈ کا خاطر خواہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ طلبہ کی جھجک دور کرنے اور کلاس روم تدریس میں انھیں شامل کرنے کے لیے ان سے بھی چھوٹی موٹی چیزیں بورڈ پر لکھوائی جاسکتی ہیں۔

اساتذہ کو اپنی تدریسی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا ان کی پیشہ ورانہ ذمہ داری ہے۔ اگر پڑھانے میں کہیں کوتاہی ہو رہی ہے یا مناسب نتائج اخذ نہیں ہو رہے ہیں تو فوری طور پر مطلوبہ طریقہ تدریس اختیار کیا جائے اور اکتساب میں درپیش رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے طلبہ میں ہونے والی مثبت تبدیلیوں پر نظر رکھے بلکہ خود اپنا محاسبہ بھی کرتا رہے۔ طلبہ کی صلاحیتوں کی جانچ الگ الگ طریقوں سے کی جاتی ہے مگر معلم کی تدریسی صلاحیتوں کی جانچ پر عام طور پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ اگر اساتذہ کے پورے انہماک سے پڑھانے کے باوجود اچھے نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں تو ممکن ہے کہ معلم کے طریقہ تدریس میں کوئی نقص ہو۔ ایسی صورت حال پیش آنے پر معلم کو اپنا طریقہ تدریس بدلنا پڑتا ہے۔ تدریس میں ٹکنالوجی کے استعمال کو لازماً شامل کرنا پڑتا ہے۔ معاون تدریسی اشیاء کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اگر روایتی تدریس کے بعد متوقع نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں تو اساتذہ میں تدریسی حکمت عملیوں میں تبدیلی لانے کی بھی مہارت ہونی چاہیے۔ اگر تمام کوششوں کے باوجود بچوں کے سیکھنے کی رفتار توقع سے کم ہے تو معلم کو طلبہ کے ساتھ اپنے روابط اور طریقہ ہائے تدریس پر غور کرنا چاہیے۔ استاذ کی حکمت عملیوں کے سبب کلاس روم کا ہر طالب علم کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ کند ذہن، اوسط ذہن والے بچے اور ذہین بچوں کے سیکھنے کی رفتار الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ معلم کا رویہ بھی یکساں نہیں ہوسکتا۔ ہر طالب علم الگ الگ صلاحیتوں کے ساتھ اسکول آتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنا معلم کے لیے ایک چیلنج ہے اور معلم کے ذریعہ چیلنجوں کو قبول کرنے سے ہی مؤثر تدریس کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ طلبہ کو بات بات پر جھڑکنا، برا بھلا کہنا، ڈرانا اور ان کی کوتاہیوں پر بیزار ہوکر نفرت کا اظہار کرنا نہ صرف تدریس کے اصولوں کے خلاف ہے، بلکہ یہ کسی بھی زاویے سے ایک ہمدرد استاذ کے شایان شان نہیں۔ طلبہ کی تربیت کے لیے سخت کلامی کے بجائے حکمت اور نرمی سے کام لینا چاہیے۔ اور تنبیہ میں بھی محبت کی آمیزش ہونی چاہیے۔ معلم کے طرز عمل سے طلبہ پر رعب طاری ہوسکتا ہے مگر اس کے لیے بھی شفقت اور ہمدردی ضروری ہے۔ بچوں میں اطاعت اور ہمدردی کا جذبہ جگانے میں خود معلم کی شخصیت کا بڑا دخل ہے۔ بچوں کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے معلم کو سخت گیر حاکم بننے کے بجائے خوش طبعی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ معلم کی نرمی، درگذر اور محبت کا سلوک دیکھ کر بچوں میں خود اعتمادی بڑھتی ہے۔ کسی معمولی شرارت کی وجہ سے بچوں کو شرمندہ کرنا اور ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچانا فائدہ مند کم اور نقصان دہ زیادہ ہے۔ طلبہ کی اصلاح سے

مایوسی کا اظہار کسی بھی طرح حق بہ جانب نہیں۔اس سے بچتے ہوئے ان کی ستائش کرنی چاہیے۔طلبہ کی معمولی خوبیوں کی تعریف کر کے ان کا حوصلہ بڑھایا جا سکتا ہے مگر بچوں کو سخت محنتی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں دنیاوی چیلنجوں سے بھی آگاہ کرتے رہیں۔

معلم کو ہمیشہ غیر جانبدار رہنا چاہیے اور بے اعتدالی سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔بچوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ میں انصاف و مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔معلم اگر اچھا عملی نمونہ پیش کرے اور تدریس و اکتساب میں خوش دلی کا مظاہرہ کرے تو طلبہ اس کی ضرور قدر کریں گے۔بچوں کو اخلاقی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ اونچا اٹھانا بہترین تربیت ہے۔معلم کو چاہیے کہ خود پسندی سے بچے اور بچوں کو بھی اس سے بچائے۔ساتھ ہی طلبہ کو کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس دلانے میں میانہ روی سے کام لیا جائے۔تنقید و احتساب سے کامیابی کی راہیں کھلتی ہیں، مگر اعتدال سے کام لینے میں ہی بہتری ہے۔معلم کی بے نیازی اور روکھے پن سے بھی بچوں کی حوصلہ شکنی کا خدشہ رہتا ہے۔اس کے برعکس اگر بچوں کی کوششوں اور کامیابیوں کی بجا ستائش کی جائے تو ان میں مزید بہتر کارکردگی پیش کرنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔معلم اگر صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ نرم مزاج، نرم طبیعت اور نرم خو ہو تو بچوں پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہونا یقینی ہے۔

کامیاب معلم اپنے طلبہ کو ہی اپنا اثاثہ سمجھتا ہے۔اپنے طلبہ کی ترقی دیکھ کر اسے روحانی خوشی ملتی ہے۔طلبہ کی کامیابی سے اسے چین و سکون ملتا ہے۔اگر علم روشنی کی مانند پھیلتی رہے اور معلم کو پورا اطمینان ہو کہ اس کے لگائے ہوئے پودے ثمر آور درخت بن کر لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں تو اسے قلبی سکون ملتا ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ موظف اساتذہ اکثر اپنے ہونہار طلبہ کو یاد کر کے جذباتی ہو جاتے ہیں اور ان کو دل سے دعائیں دیتے ہیں۔اسی طرح زندگی میں اونچا مقام حاصل کرنے والے لوگ بھی اپنی کامیابی کے لیے اپنے اساتذہ کرام کا ہمیشہ احسان مند ہوتے ہیں اور دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کے لیے دست بہ دعا ہوتے ہیں۔اگر معلم اس بات پر غور کرتے ہوئے تدریس کا کام انجام دے کہ اس کے پڑھائے ہوئے طلبہ اس دنیا کو بہتر بنانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں اور طلبہ کے اچھے کاموں کا بیش بہا صلہ اسے بھی دنیا و آخرت میں ملنے والا ہے، تو وہ اپنے ہر کلاس کو کارآمد اور نتیجہ خیز بنانے کی دھن میں لگا رہے گا۔اس لیے تدریسی حکمت عملیاں طے کرتے وقت معلم کو دور اندیشی سے کام لینا چاہیے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مصباح انظر
اسسٹنٹ پروفیسر
مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعہ تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔32
موبائل۔9948412484

# سائنس اور انسان

سائنس انسان کا وہ سرمایہ ہے جسے انسان نے ہزاروں برس کی کوششوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ انسان نے دنیا میں جب آنکھیں کھولیں تو اپنے چاروں طرف موجود چیزوں کا مشاہدہ کرنا شروع کیا اور اس کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوئے جس کی بنا پر اس نے ماحول میں موجود چیزوں کے بارے میں مختلف قسموں کے نظریات قائم کے لیے اور جیسے جیسے وقت گزرتا رہا اس نے اپنی معلومات میں اضافہ کیا اور مشکلیں حل کرتا رہا اس کے نتیجے میں اس نے اپنی معلومات میں اضافہ کیا اور مشکلیں حل کرتا رہا' اس طرح اس کے ذہن سے غلط باتیں خود بخود ختم ہونے لگیں اور صحیح باتیں اس کے سامنے آگئیں۔ یہی انسان کے درمیان سائنس ہے۔

آپ کو شاید یاد نہ ہو' انسان کو زمین پر رہتے ہوئے تقریباً ہزاروں سال گزر چکے ہیں۔ انسان کے غور کرنے اور سوچنے کا ابتدائی دور وہ تھا جب انسان نے قدرتی ماحول میں موجود چیزوں کے بارے میں غور کرنا شروع کیا۔ مثال کے طور پر سورج' چاند' ستارے' بجلی کی چمک' بادل کی گرج' آندھی' بارش' سیلاب' زلزلہ وغیرہ کے بارے میں اور اس کو سوچنے کا یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا' یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اب بھی یہ کام جاری ہے اور اس طرح سائنس انسان کی زندگی کی سب سے بڑی دین ہے۔ آج انسان کے چاروں طرف سائنس نے بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ آج کا انسان جب صبح اٹھتا ہے تو وقت معلوم کرنے کے لیے گھڑی کا سہارا لیتا ہے۔ روزمرہ کے دوسرے کاموں کو کرنے کے لیے سائیکل' اسکوٹر اور ٹیکسی اور بسوں کا استعمال کرتا ہے۔ اونچی عمارتوں میں چڑھنے کے لیے لفٹ کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ آج کھانا پکانے میں بہت کم وقت صرف ہوتا ہے کیونکہ اس کام کو پریشر کوکر نے آسان کردیا ہے۔ ٹیلی فون' ریڈیو' ٹیلی ویژن' ہوائی جہاز اور اسی طرح کی بہت سی ایجادوں نے ہمیں قدیم دور سے نکال کر نئے سائنسی دور میں پہنچادیا ہے۔

تیل' کوئلہ اور پانی قوت کے پرانے ذخیرے ہیں موجودہ دور میں ایک نئی قوت کی دریافت ہوئی ہے جسے ہم جوہری توانائی (ایٹامک انرجی) کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کا انحصار جوہر یا ایٹم پر ہے اس کی قوت کا اندازہ آپ اس سے لگاسکتے ہیں کہ اگر ایک لیٹر پانی کی ایٹمی توانائی کو کسی صورت سے حرارت میں تبدیل کردیا جائے تو اس حرارت کی مقدار اتنی ہی ہوگی جتنی کہ چالیس لاکھ ٹن کوئلہ جلانے سے ہوی ہے۔ ایٹم سے ایٹم بم تیار کیا گیا تو دنیا کے لیے تباہی کا سبب بنا لیکن ایٹم کی ساری دریافتیں صرف انسانی تباہی کے لیے ہی استعمال نہیں ہورہی ہیں بلکہ توانائی کی فراہمی سے آپ دوز کشتیوں' بحری جہازوں کو چلانے' زراعت کو ترقی دینے اور دوائیں تیار کرنے میں مدد لی جارہی ہے موسم کی جانکاری میں سائنس نے انسان کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ مختلف بیماریوں میں آج سائنس کے نئے آلات کی مدد سے بیماریوں کو پہچانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر گردے کی بیماری میں ڈائلسس کا استعمال' کینسر کی بیماری میں کیٹ اسکین اور کوبالٹ تھراپی جیسے جدید سائنسی آلات بے مثال خدمت انجام دے رہے ہیں۔ سائنس نے انسانی بینائی (دیکھنے کی روشنی) کو واپس کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ کان کے سننے کی طاقت کی مشین آج کس قدر عام ہوگئی ہے یہی وجہ ہے کہ آج انسان کی زندگی کی اوسطاً عمر بڑھ گئی ہے جس کا سہرا بغیر شک وشبہ کے سائنس کے سر ہے۔

سائنس وٹکنالوجی

الیکٹرانک ٹیلی فون

ہندوستان کا پہلا خلائی ماڈل

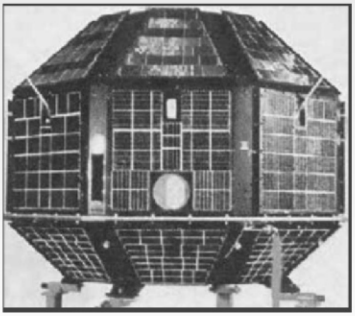

آج کا انسان موجود سائنس کے اس مشینی دور میں کس قدر مصروف ہوگیا ہے کہ اب سائنس کی مدد کے بغیر کسی بھی شخص سے رابطہ قائم نہیں کرسکتا۔ آج اس کی کمی ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن نے پوری کردی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان سائنس کے ذریعے کس قدر قریب ہوگیا ہے۔

گزشتہ کچھ برسوں میں ہندوستان نے سائنسی میدان میں کس قدر ترقی کی ہے۔ جس کی وجہ سے آج ہندوستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جو خلائی سائنس میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اور خلائی سائنس بھی انسانی مشکلات کو مختلف طریقوں سے حل کرنا چاہتی ہے۔ 17 مارچ 1988ء کو ہندوستان نے پہلا مواصلاتی سیارہ چھوڑا تھا جس کا تجربہ بہت کامیاب رہا ہے اور آج اس سیارے

(آئی۔آر۔ایس۔ون۔اے) کے ذریعے کھیتی، مچھلی کی تجارت، جنگلوں اور سمندری موسم کے بارے میں جان سکتے ہیں کہ اس کے ذریعے پانی میں موجود گندگی، پہاڑوں کے اندر چھپے خزانوں اور پہاڑی تبدیلیوں کو دور سے بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ جو انسانی زندگی کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

حقیقت تو ہے یہ کہ سائنس کے بغیر انسانی زندگی کا صحیح معنوں میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، ہماری زندگی میں ہر قدم پر سائنس نے اپنا جال بچھا رکھا ہے۔ تعلیم کے پھیلاؤ نے انسان کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ جس سے انسان کے اندر سائنسی مزاج پیدا ہوا ہے۔ پہلے لوگ خلائی سائنس کو بہت اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن مصنوعی سیاروں کے کارنامے نے ہر انسان کو اس جانب متوجہ کیا ہے۔ اسی طرح ایک وہ زمانہ تھا جب برطانیہ کے سائنس دانوں نے چشمے کا گلاس (شیشہ) ایجاد کیا تو وہاں لوگوں نے اسے استعمال کے لیے مناسب نہیں سمجھا اور اس سے تیار شدہ چشمے آدمی تو پہنتے تھے لیکن عورتیں نہیں پہنتی تھیں وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ لوگوں کا خیال بدلا اور سبھی لوگ اس کا استعمال کرنے لگے اس سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ سائنس کے اس دور میں انسان پوری طور پر ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے اندر سائنسی خیال اور مزاج پیدا کرنا ہوگا اور غیر بنیادی (توہمات) اور پرانے خیالات میں تبدیلی کرنی ہوگی جن کا سچائی سے دُور کا واسطہ نہیں ہے اگر سائنس اور انسان کے درمیان پوری طور پر تال میل پیدا ہو جائے تو بلا شک وشبہ دونوں کے قدم مل کر آگے بڑھیں گے جب ہی ہم سائنس سے پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

ملک کا پہلا مواصلاتی سیارہ آئی آر ایس وَن اے

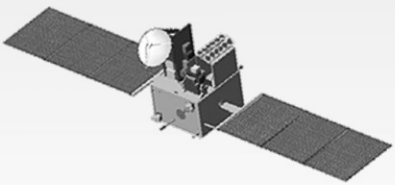



دنیا کا سب سے بڑا اخلائی ٹیلسکوپ

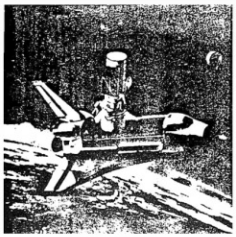

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہندوستان کی ایک بڑی آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ سائنس کے ذریعے ہی آج گاؤں کو بڑھانے میں بڑی مدد ملی ہے۔ اگر چہ گاؤں کے کچھ لوگ شہروں میں جا کر اپنی روزی روٹی کمانے کے لیے نوکری اور تجارت کرتے ہیں۔ پھر بھی آج سائنس کے ذریعے دیہات کے نوے فیصد سے زائد لوگ دیہات میں رہ کر کھیتی اور جانوروں کو پالتے آرہے ہیں لیکن اب دیہات میں بھی صنعتیں شروع ہوگئی ہیں' کارخانے لگنے شروع ہوئے ہیں' جس کے ذریعے دیہات کے عوام بھی سائنس کے قریب آرہے ہیں۔ دیہات کی آبادی نے آج مختلف قسم کی صنعتوں سے فائدہ اٹھایا ہے جس کے نتیجے میں وہاں فصلوں کی پیداوار بہت بڑھ گئی ہے۔ کھیتی کرنے میں مددگار سائنسی آلات آج وہاں عام ہورہے ہیں۔ آبپاشی کے کھیتوں میں پانی دینے کی سائنسی سہولتیں وہاں پہنچ گئی ہیں اور سائنس کے ہی ذریعے وہاں کی زندگی بدلی ہے اور ترقی کی شروعات ہوئی ہیں۔

ان چند مثالوں سے سائنس اور انسان کے درمیان کے گہرے رشتے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ آج ہم دنیا میں جہاں بھی نظر ڈالیں گے ہمیں سائنس کی کارستانیاں نظر آئیں گی۔ سائنس کے عام ہونے کی ہماری زندگی میں ایک خاص وجہ یہ ہے کہ سائنس کی بنیاد اصول پر قائم ہے۔ مثلاً ہر چیز کو سائنس نزدیک سے دیکھتی ہے' پرکھتی ہے اور جانچ کرتی ہے۔ اور سائنس کو سوچنے سمجھنے کا دارومدار اسی پر قائم ہے۔ آج ملک میں جو ترقی ہوئی ہے وہ کوئی کرشمہ نہیں ہے بلکہ سائنسی میدان میں کامیابیاں اس کی ذمہ دار ہیں جس کا فائدہ انسان نے اٹھایا ہے۔ اگر آج انسان میں سائنسی مزاج پوری طور پر پیدا ہو جائے تو وہ سمجھ سکے گا کہ دوسرے انسان کی مشکلات کیا ہیں پھر انسانوں کے درمیان فرق باقی نہیں رہے گا اور سماجی خوشیاں ایک مستقل حقیقت بن جائیں گی لیکن اگر انسان اپنی سائنسی ایجادوں کو انساوں کی تباہی کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے سائنس کے اخلاقی قوانین کا بالکل علم نہیں ہے۔

☆☆☆

محمد خلیل سائنسداں
نئی دہلی
موبائل : 8929809986

**مضمون نگاران سے ایک درخواست**

مضامین صاف' خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں ۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروا رہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی' اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

# افراط کائنات.....ہماری کائنات کا حیرت انگیز مظہر.

ہماری کائنات کئی سربستہ رازوں کا مجموعہ ہے۔ جیسے جیسے سائنس ترقی کرتی گئی ہماری کائنات کے یہ پراسرار سربستہ راز منکشف ہونا شروع ہوئے۔ آج ہم ہماری کائنات میں پائے جانے والے حیرت انگیز مظہر ''افراط کائنات'' کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

افراط کائنات کو سمجھنے سے پہلے ہم انفجار عظیم کو سمجھیں گے۔ انفجار عظیم یعنی بگ بینگ (Big Bang) اس کائنات کی پیدائش کے بارے میں پیش کیا جانے والا ایک علمی نظریہ ہے اور کائنات کے آغاز کے لمحے سے متعلق ہے۔ بگ بینگ یعنی عظیم دھماکہ کا واقعہ آج کے دور سے تقریباً 13 ارب 70 کروڑ سال قبل ظہور پزیر ہوا تھا اور زمین کی تشکیل بگ بینگ کے تقریباً ساڑھے نو ارب سال بعد ہوئی۔ انفجار عظیم یا بگ بینگ ہماری کائنات کا وہ نقطہ ہے جہاں سے پوری کائنات کا وجود ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کائنات آہستہ آہستہ بننا شروع ہوگئی۔ جب یہ دھماکہ ہوا تو کچھ وقت کے لئے یعنی سیکنڈ کے بہت چھوٹے سے حصے کے لیے بہت زیادہ کائنات میں پھیلاؤ ہوا۔ اس کے بعد ہماری کائنات معمول کے مطابق پھیل رہی ہے۔ ہماری کائنات کے ابتدائی ایک سیکنڈ کے بہت چھوٹے سے حصے یعنی) پہلے سیکنڈ کے 10 کی قوت نما منفی 36 سے لے کر 10 کی قوت نما منفی 32 سیکنڈ ( $10^{-36}$ سے $10^{-32}$ ) (کے درمیان کائنات کے بہت تیزی سے پھیلنے کے اس مظہر کو افراط کائنات (Inflation) کہتے ہیں۔ اور اس تیزی سے پھیلنے کے سبب کائنات کا حجم کروڑوں گنا بڑا ہوگیا۔

پہلے انسان یہ سمجھتا تھا کہ صرف دودھیہ کہکشاں ہی ہماری کائنات ہے' پر اب ہمیں پتہ ہے کہ دودھیہ کہکشاں صرف ایک کہکشاں ہے اور اس جیسی لاکھوں کہکشائیں ہماری کائنات میں موجود ہیں۔ سائنسدانوں جیسے آئن سٹائن، ہبل وغیرہ کی تحقیقات سے ہمیں معلوم ہوا کہ دودھیہ کہکشاں ہی تک ہماری کائنات محدود نہیں ہے۔ تقریباً 1919 میں ہبل نامی سائنسداں نے اپنے وقت کا سب سے بڑا اور طاقتور دوربین بنایا اور اس دوربین سے اس نے کائنات کا مشاہدہ کیا۔ اس طرح اس کائنات کے بارے میں بہت حیرت انگیز معلومات ہمیں حاصل ہوئیں۔ ہبل نے کائنات کا مشاہدہ کرتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس میں یہ بتلاتا ہے کہ کائنات دراصل پھیل رہی ہے۔

اس کے بعد سائنسدانوں نے طاقتور دوربینوں کو خلا میں سٹیلائٹ کے ساتھ بھیجا۔ اس طرح سائنسداں سٹیلائٹ سے حاصل ہونے والا یہ ڈیٹا جمع کرتے رہتے ہیں اور اپنی کائنات کا ماڈل یا نمونہ ترتیب دیتے رہتے ہیں۔ گویا کہ یہ مراحل اب بھی جاری ہیں اور اس طرح ہم ہماری کائنات کا نمونہ آہستہ آہستہ بناتے جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس جتنے بھی دوربین ہیں وہ تمام کے تمام ایک ہی رخ پر آسمان میں ایک چھوٹے سے حصے کو مرکوز کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کو پورے آسمان سے ہر طرف سے ڈیٹا جمع کرنا ہے تب یہ دوربین اس کے لیے بہت مددگار ثابت نہیں ہوتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے محققین ایک ہمہ جہتی دوربین بنا رہے ہیں جس میں 128 انٹینا کو لگایا گیا ہے اور وہ ساری اسپیس سے ڈیٹا کو جمع کر رہے ہیں جو کہ 13.7 بلین سال پرانا ہوتا ہے۔ اب ہم آسمان میں صرف ایک طرف کو مرکوز نہیں کر رہے ہیں بلکہ کائنات کا ڈیٹا جمع کر رہے ہیں جو بہت زیادہ ہوتا ہے یہ GB20 فی سیکنڈ کا ڈیٹا ہوتا ہے جس کے پیچھے بہت زیادہ سرور کام کر رہے ہوتے ہیں اور اس ڈیٹا سے ہم اپنی کائنات کا ماڈل تیار کر رہے ہیں۔

اب ہم افراط کائنات کی جانب آتے ہیں۔ سائنسدانوں کی توجہ افراط کائنات کے تصور کی جانب جانے کا سبب یا پس منظر میں دراصل کچھ چیزیں تھی۔ سائنسداں جب اس کائنات کا مشاہدہ کر رہے تھے تب ان کے سامنے کچھ ایسے سوالات آئے جن کے جوابات حاصل

سائنس وٹکنالوجی

نہیں ہو رہے تھے تو ان سوالات کے جوابات کو حاصل کرنے کے دوران سائنسدانوں کی توجہ افراط کائنات کے تصور کی جانب مبذول ہوئی۔ مثال کے طور پر ریاضی کو استعمال کرتے ہوئے ہماری کائنات کو دیکھیں تو یہ بالکل مسطح ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسی طرح مسئلہ افق ہے جس کے مطابق کائنات کے افق پر پائے جانے والے کوئی دو کنارے متجانس و آئسوٹرا پک ہوتے ہیں۔ کیونکہ دو افق پر پائے جانے والے کناروں کا کبھی بھی آپس میں رابطہ میں رہنا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ ایک افق والے کنارے اور دوسرے کنارے کا درمیانی فاصلہ تقریباً 28 بلین سال ہوگا۔ اس وجہ سے ان کا رابطہ میں رہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ ایک دوسرے سے متجانس و آئسوٹرا پک ہوتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ ایسے سوالات تھے جس کے جوابات کی جستجو سائنسدانوں کو افراط کائنات کے تصور کی جانب لے آئی۔ اور پھر افراط کائنات کے نظریہ نے اس کے جوابات بھی دئے۔ جیسے کہ مسطح کائنات کا مسئلہ ہے۔ اسکو سمجھنے کے لئے آپ ایک مثال پر غور کریے۔ فرض کریئے کہ ایک غبارہ ہے اسمیں تھوڑی سی ہوا ہے اس پر ایک چیونٹی ہے یہ اس پر چل رہی ہے۔ اس کے لئے غبارہ کی سطح منحنی ہوگی۔ پھر اگر اس غبارہ میں بہت زیادہ ہوا بھر دی گئی تب غبارہ کی جسامت بہت بڑھ جائے گی اور اگر چیونٹی اب اس پر حرکت کر رہی ہے تب غبارہ کی سطح چیونٹی کے لئے مسطح ہوگی۔ اسی طرح نظریہ افراط کائنات کے مطابق کائنات بہت چھوٹے سے وقفہ میں کئی گنا بڑی ہوگئی۔ اسی وجہ سے جس طرح چیونٹی کو بڑا غبارہ مسطح نظر آتا ہے اسی طرح ہمیں کائنات مسطح نظر آتی ہے۔ اس طرح نظریہ افراط کائنات مسطح کائنات کے مسئلہ کو حل کرتا ہے اور اگلا مسئلہ افق ہے۔ اس کا حل نظریہ افراط کائنات کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ کائنات کے افق پر پائے جانے والے دو کنارے پہلے قریب اور رابطے ہی میں تھے لیکن افراط کائنات کی سبب یہ بہت تیزی سے دور ہو گئے یہ ہی سبب ہے کہ یہ متجانس اور آئسوٹرا پک ہوتے ہیں۔ اس طرح افراط کائنات ان مسائل کا حل اور ایسے اور دوسرے مسائل کا حل فراہم کرتا ہے۔

پرسوال یہ ہے کہ انفلیشن یا افراط کیوں ہوا۔ دراصل کائنات ابتدائی دور میں غیر سمتی میدان پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کو عام طور پر اسکیلر فیلڈ کہتے ہیں۔ اس غیر سمتی میدان میں یا اسکیلر فیلڈ میں موجود توانائی بالقواء ہی اس افراط کائنات کے مظہر کا سبب بنتی ہے۔ جس کو ماہرین کونیات ریاضی کو استعمال کرتے ہوئے بتلاتے ہیں۔

افراط کائنات کا نظریہ 1970 کی دہائی کے آخر اور 1980 کی دہائی کے اوائل میں پیش کیا گیا تھا، جس کو متعدد طبیعیات دانوں نے پیش کیا، جن میں الیکسی اسٹاروبنسکی، Alexei Starobinsky الین گتھ Alan Guth، پاول اسٹین ہارڈ Paul Steinhard اور آندرے لنڈے Andrei Linde شامل ہیں۔ یہ سائنسداں ہیں جو بگ بینگ پر کام کر رہے تھے اور 1980 میں وہ ریاضی کے ماڈلس کے ذریعہ کائنات کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس میں وہ یہ تحقیق کر رہے تھے کہ چھوٹے چھوٹے ذرے جو ہر اور ذیلی ذرات کس طرح وجود میں آئے اور اس کوشش کے دوران ان کے سامنے کچھ نئی چیزیں آئیں۔ اس میں سے ایک چیز افراط کائنات بھی تھی۔ ان کے استعمال کئے جانے والے ریاضی کے ماڈلس سے انہیں معلوم ہوا کہ جب بگ بینگ ہوا تب اس کے بعد سکنڈ کے بہت چھوٹے سے حصے تک کائنات بہت زیادہ پھیلی اسی کو افراط کائنات یا انفلیشن کہتے ہیں اور پھر اس کے بعد کائنات عام شرح کے ساتھ پھیل رہی ہے۔

افراط کائنات (انفلیشن) کے مظہر کو مختلف سائنسداں اپنے اپنے انداز اور طریقوں سے سمجھایا اسے افراط کائنات کے نمونوں یا ماڈل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان میں چند کے نام یہ ہیں۔ اولڈ انفلیشن، نیو انفلیشن، پاور لا انفلیشن، برین انفلیشن، کے انفلیشن وغیرہ۔

اس تصویر میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پہلے بائیں جانب انفجار عظیم (بگ بینگ) ہوا۔ اس انفجار عظیم کے بعد کائنات پیدا ہوئی لیکن ایک سکنڈ کے چھوٹے حصے کے اندر اندر بہت تیزی سے کائنات پھیلتی ہے اسی مظہر کو افراط کائنات کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس کائنات کے پھیلنے کی رفتار اتنی تیز نہیں ہے

اس کے بعد پھر پروٹان پیدا ہوئے اوراس کے بعد ہائیڈروجن جو ہر پیدا ہوئے اس کے بعد ستارے، سیارے وغیرہ وجود میں آئے۔اور آخر میں موجودہ کائنات نظر آرہی ہے۔

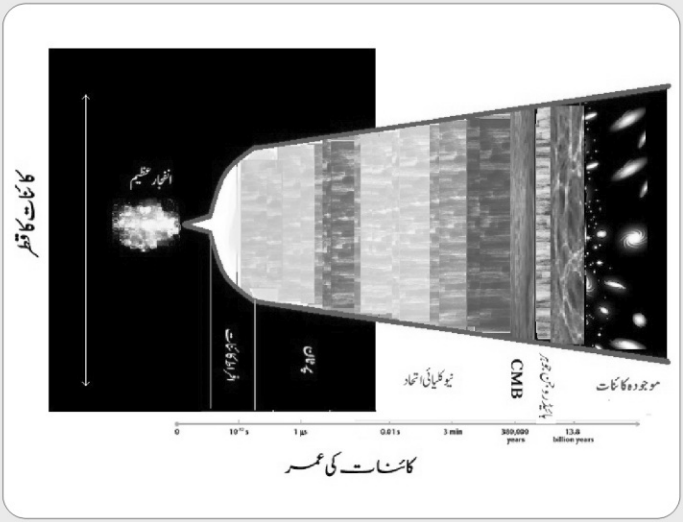






انفجارعظیم و افراط کائنات کے مظہر کی تصدیق کے لئے سائنسدانوں نے مختلف قسم کے سٹیلائٹس کو خلا میں بھیجا جیسے کہ WMAP,PLANCK سٹیلائٹ BICEP2, وغیرہ۔سائنسداں ان دریافتوں اور کوششوں کے بعد بہت زیادہ خوش تھے کہ ہم نے مختلف قسم کے سیٹلائٹ کو خلا میں بھیجا اور ہم نے CMB کے فنگر پرنٹس تمام کائنات سے حاصل کیے CMB کا مطلب ہوتا ہے کہ کائناتی خورد بینی موجی تابکاری پس منظر (Radiation Background Microwave Cosmic) طبیعیات میں دراصل ایک قسم کی برقی مقناطیسی شعاعوں کو کہا جاتا ہے جنکو 1965 میں دریافت کیا گیا ہے۔جو بگ بینگ کے سبب ہماری کائنات میں پیدا ہوئے۔ Alan Guth کا کہنا تھا کہ ان کے کئے گئے حسابات اور CMB کی profile temperature کو آپس میں ملا کر اور تقابل کر کے دیکھیں گے۔CMB کو اگر ہم دیکھیں گے تو ہمیں اس میں جو سرخ رنگ نظر آتا ہے وہ دراصل انتہائی گرم حصہ ہوتا ہے اور جہاں پر نیلا رنگ ہوتا ہے یہاں کی تپش بہت کم ہوتی ہے اور اسطرح یہ ہمیں بگ بینگ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ اسی سبب سے اس کے بعد وجود میں آنے والی تابکاری ہے۔WMAP سٹیلائٹ نے 2001 اپنا ڈیٹا بھیجا وہ ڈیٹا بالکل سائنسدانوں کی گئی پیشین گوئیوں کے ساتھ مل رہا تھا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ افراط کائنات یعنی انفلیشن ہوا تھا اس طرح یہ ایک بہت بڑی دریافت تھی اس پر ایلکسی اسٹاروبنسکی ،ایلن گتھ ،اور آندرے

لنڈے کو بہت زیادہ انعامات سے نوازا گیا۔اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراط کائنات یعنی انفلیشن کیسے رکا، کیا پھر سے انفلیشن ہوسکتا ہے۔ VilenkinAlex ایک سائنسداں تھے'ان کے نزدیک کائنات پانی کے بلبلے کی طرح تھی اوران کے نزدیک کائناتیں پانی کے بلبلے کی طرح ایک مقام سے دوسرے مقام پر جارہی ہیں اور آپس میں یہ ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور یہ ایک بلبلے سے دوبلبلوں میں بھی تبدیل ہورہی ہیں۔ایک دن VilenkinAlex کے ذہن میں ایک خیال آیا اوران کو یہ محسوس ہوا کہ ان کو پتہ چل گیا ہے کہ کس وجہ سے افراط کائنات رکا۔ان کا یہ خیال ہے کہ افراط کائنات یا انفلیشن رکا نہیں بلکہ افراط کائنات یا انفلیشن اب بھی ہورہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف جگہوں پر بگ بینگ ہورہے ہیں کیونکہ اس کے بعد انفلیشن ہوتے ہیں اگر چہ کہ افراط کائنات یا انفلیشن یہاں پر رکا ہے تو کسی اور جگہ پر ہورہا ہے۔ اس تصور کا نام رکھا گیا ''ختم نہ ہونے والا انفلیشن''۔اس کے مطابق افراط کائنات یا انفلیشن دائمی لازوال اور مسلسل ہے۔اس کے مطابق بہت سی کائناتیں ہیں۔کسی کائنات میں افراط یا انفلیشن یا پھیلاؤ ہورہا ہوتا ہے اور کسی کائنات میں پھیلنے کی شرح نارمل ہوتی ہے اور کسی کائنات میں یہ ختم ہورہی ہوتی ہے پر تمام اسپیس کے انفلیشن یا افراط کائنات کو مجموعی طور پر دیکھیں تو ان کا مجموعہ ایک ہی ہوتا ہے۔

ہم ان کائناتوں کو دیکھ نہیں سکتے۔اس کا سبب ہے کہ ان کائناتوں سے ابھی تک روشنی ہم تک نہیں پہنچ سکی جس وجہ سے ہم ان کائناتوں کو دیکھ نہیں سکتے ہیں۔اس نظریہ پر اس وقت بہت زیادہ بحث ومباحثہ چل رہے ہیں۔کچھ لوگ اس کے حق میں ہیں اور تائید میں گفتگو کررہے ہیں اور کچھ لوگ اس کی مخالفت میں گفتگو کررہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ایسے ٹولز وآلات ہمارے پاس دریافت ہورہے ہیں اور ایسے نظریات آرہے ہیں جس سے یہ پتہ چلنا شاید ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ کائناتیں موجود ہیں۔

افراط کائنات پچھلی صدی کی سائنس کی دریافتوں میں سے اہم دریافت ہے۔ہم نے دیکھا ہے کہ افراط کائنات بہت سادہ سا مظہر ہے۔پر یہ ہماری کائنات کے فہم میں درپیش سوالات کے جوابات فراہم کرتا ہے۔نہ صرف جوابات فراہم کرتا ہے بلکہ ان جوابات کی عملی طور پر تصدیق بھی ہورہی ہے۔فضاء سے سٹیلائٹ جو معلومات فراہم کررہے ہیں وہ معلومات اس نظریہ کو نہ صرف تقویت فراہم کررہے ہیں بلکہ عملی طور پر اس نظریہ کی تصدیق بھی کررہے ہیں۔اس عنوان پر تحقیقی کام ومزید معلومات کے حصول کی کوشش ابھی جاری ہے۔امید ہے کہ یہ معلومات ودریافتیں ہماری کائنات کے فہم میں اہم قدم ثابت ہوں گی۔

حوالہ جات:

1-فرسٹ سیکنڈ آف دی بگ بینگ". ہاؤ دی یونیورس ورکس. 2014. ڈسکوری سائنس.
2-تسوجیکاوا، شینجی (28 اپریل 2003). "انٹروڈکٹری ریویو آف کوسمیک انفلیشن". ارزیو: ہیپ-پیچ / 0304257.
3-گوتھ، الن ایچ. (1997). دی انفلاشنری یونیورس: دی کوئسٹ فور نیو تھیوری آف کوسمیک اوریجنس. بیسک بکس. پ. 234–233. آئی اس بی ین 978-0201328400.
4۔نارلینکر، کیمبریج یونیورسٹی پریس، انٹروڈکشن ٹو کوسمالاجی، (2022)'5۔انفلیشن، عدیل امتیاز، تختی ڈاٹ کام۔
6-گوتھ، پھیسی ترانسیشنس ان دی ویری ارلی یونیورس، ان دی ویری ارلی یونیورس، آئی اس بی ین 0-521-31677-4 .
7-ست ینخاردت، پال جے. (2011). "دی انفلیشن ڈیبیٹ: اِس دی تھیوری ایٹ دی ہارٹ آف ماڈرن کوسمولوجی". سائنٹیفک امریکن. جلد. 304، نمبر. 4. صفحہ. 25–18.
8-آ. لینڈی، پارٹیکل فیزکس اینڈ انفلاشنری کوسمولوجی، حارووڈ، (1990)

☆☆☆

محمد عبدالمعز: ریسرچ اسکالر، شعبہ طبعیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد و
ڈاکٹر رضوان الحق انصاری: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ طبعیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

# بجھ گئی شمعِ آرزوئے زیست

زینت بیگم نے ملازمہ کو آواز دی۔

''نوربی! ذرا ادھر آنا تو!! چاند نظر آ گیا؟''

''ہاں! بیگم صاحبہ! چاند تو نظر آ گیا..... ابھی کچھ ہی دیر میں سائرن سنائی دے گا۔'' نوربی نے کہا۔

زینت بیگم کی شخصیت میں نور و سرور کی کیفیتیں اجاگر ہونے لگیں، کیونکہ ماہوں کا ماہ، دنوں کا بادشاہ، لمحوں کا نقیب، ماہِ منور دنیا والوں کو صیام وصلوٰۃ کی خوشخبری سنا رہا تھا۔

''نوربی! سحری کے لئے کوئی سالن یا کباب بنا کر فریج میں رکھ دینا، میٹھا تو نہ خالد کو پسند ہے نا شاہد کو، اس لئے کوئی میٹھا بنانے کی ضرورت نہیں۔''

سائرن کی آواز کے ساتھ ہی مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

''کل پہلا روزہ ہے۔ مبارک ہو.....''

''السلام علیکم امّی جان!'' بیٹوں اور بہوؤں نے آ کر ایک ساتھ زینت بیگم کو سلام کیا، وہ جانماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں .....انہوں نے اُٹھ کر سب کو گلے سے لگایا..... شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے اپنی بہوؤں سے ..... بڑی ہی محبت سے کہا:

''گوہر، سیما!! گھر کا سامان اور افطاری کا سودا بہت سوچ سمجھ کر منگوایا کرو۔ زیادہ پکانا اور ضائع کرنا اسراف کی علامت ہے، افطار کے پکوان میں نور اور ڈرائیور کا خاص خیال رکھنا، ہمارے ملازمین ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں..... ان کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہئے۔''

''اماں جان! اب آپ کی عمر آرام کی ہے، آپ اللہ اللہ کریں، بس ہمیں آپ کی دعائیں چاہئیں! آپ ہماری فکر کرنا چھوڑ دیں۔''

اور پھر زینت بیگم نے یوں آنکھوں میں حیرت بھر کر دیکھا جیسے وہ کہہ رہی ہوں.....

''بس ساسو ماں.....! بہت حکومت کر لی آپ نے ..... اب ہمارا زمانہ ہے..... کچھ محکومی کا بھی مزہ چکھ لیں۔''

بظاہر تو انہوں نے مسکرا کر بہو کے خیال کی تائید کی۔ مگر دل کے جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوں..... انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری، ان کی پلکوں سے آنسوؤں کے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر دامن پر گرنے لگے۔

وہ فجر کے لئے اٹھیں تو بہو کی طرف سے ان کا دل صاف ہو گیا تھا، ماں کا دل دریا ہوتا ہے، ایک موج آئی اور تمام دُکھ، غصہ اور نفرتیں بہا کر لے گئی..... ساری باتوں کو بھلا کر وہ پہلے روزے کا استقبال کر رہی تھیں۔

گھر میں اس قدر افطار کا سامان آتا کہ بس ..... دال اور پکوڑے نوربی تل لیتیں، سموسے نمکو، دنیا بھر کے مشروبات ضرورت سے زیادہ منگوائی جاتیں..... روزہ تو زینت بیگم اور

افسانے

دونوں بیٹے ہی رکھتے تھے، بڑی بہو گوہر نے تو کبھی روزے رکھے ہی نہیں.....اور چھوٹی بہو سیما روزے تو رکھتی مگر.....وہ گنڈے دار یعنی گن گن کر.....

زینت بیگم کو بڑا افسوس ہوتا کہ کسی کو اس فضول خرچی پر ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا، لوگ بھوکے مر رہے تھے..... وہ ان کی آنکھیں کیسے کھولتیں، کیسے اُن کے احساسات کو جھنجھوڑتیں، نہ کسی کو اخبار پڑھنے کی توفیق تھی ..... نہ ہی ٹی وی پر نیوز دیکھتیں کہ آج کے حالات کا اندازہ ہی ہوسکتا۔ وہ کس سے اپنے خیالات کا اظہار کرتیں.....ان کا راج پاٹ تو اب ختم ہو چکا تھا، اب وہ اولاد کے رحم وکرم پر تھیں۔

پھر وہ بھی دو ایک افطاری کی پلیٹیں بنا کر مسجد میں بھیج دیا کرتیں، انہیں اس بات سے بہت دُکھ ہوتا تھا کہ بہو بیٹوں نے نماز یا قرآن خوانی یا تلاوت کا کوئی اہتمام نہ کیا، زبردستی کے روزے، اس پر کھانے پینے کی چیزوں کی بربادی، افطار کے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی۔ توبہ۔ ذرا بھی تمیز نہ سکھائی تھی اُن کو۔

جب بھی زینت بیگم کو دکھ پہنچتا وہ ٹھنڈی سانس بھرتیں، ان کے احساسات مجروح ہوتے تو انہیں اپنا خوبصورت ماضی شدت سے یاد آنے لگتا۔ جہاں بے فکری سے دن گذرتے۔ ان کی امی کو بھی بڑا شوق تھا کہ گھر میں ہر چیز کی افراط ہو، کمی نہ پڑے کسی چیز کی۔ اچانک کوئی مہمان آجائے تو ضیافت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ وہ بہت دل والی تھیں، ہر ایک کا خیال رکھتی تھیں۔ کوئی چیز ضائع نہ ہونے دیتیں۔ افطار کا اہتمام وہ خود کرتی تھیں، چنے کی دال یا چھولے ہوتے، آلو پیاز اور پالک کے پکوڑے الگ، نمک پارے، خستہ میٹھی کھجوریں اور قیمہ بھرے سموسے اکثر چار پانچ دوست ابا کے ساتھ روزہ کھولتے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ ستا زمانہ تھا.....لوگ تھوڑے میں بھی بہت خوش رہتے تھے، سبھی کی زندگی کا مقصد خلوص ومحبت کے سوا کچھ اور نہیں تھا، روزے دکھاوے کے نہیں؛ بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لئے رکھتے تھے، کسی کے دل میں چھل کپٹ نہیں۔

پھر عید کی شاپنگ شروع ہوگئی۔ ہنگامے جاگ اُٹھے، ہر بچے کی پسند، ہر بڑے کا شوق مدّ نظر رکھتے ہوئے، کبھی گوہر بچوں کو کار میں بھر کر نکل جاتیں۔ کبھی سیما۔ اُن لوگوں نے سارے بازار کھنگال ڈالے، ہر جوڑے کی میچنگ کے جوتے، موزے، چوڑیاں، دنیا بھر کی چیزیں خریدی گئیں، اس کے باوجود کسی کے چہرے پر سچی مسرتیں نظر نہ آرہی تھیں۔ جو انہوں نے اپنے لڑکپن میں محسوس کیا تھا۔ تیس روزے پورے ہونے کی خوشی کیسے آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ معمولی چیزیں ہی خرید کر خوشی سے نہال ہوجاتی تھیں۔ نہ کسی کو کسی سے شکوہ نہ شکایت.....

مگر آج .....میاں بیوی میں بھی رقم کے پیچھے تکرار اور گرما گرمی، بحث مباحثہ ہوتا رہتا ہے، کتنی ہی رقم شوہر نے دی ہو.....لیکن لب پر کبھی بھی شکر کے دو لفظ نہ ہوتے.....زینت بیگم خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہتیں.....کیونکہ ان کے بولنے کا زمانہ اب ختم ہو چکا تھا، صرف کان اور آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں.....سوچا تھا ان کے ایثار، شب بیداری اور جذبوں کا کوئی تو صلہ ہوگا، مگر کہاں؟ مکان اور چار دکانیں اگر ان کے نام نہ ہوتیں تو یہ بہو بیٹے کبھی کا انہیں دیس نکالا دیتے..... جب سرکا

افسانے

سائیں نہ رہا تو یہ دولت' جائیداد کس کام کی۔ بہت پہلے ہی انہوں نے دو دوڈ کانیں دونوں بیٹوں کے نام کردی تھیں۔ یہ گھر جس میں سب رہتے تھے وہ اپنے نام ہی رہنے دیا۔ حالانکہ سب کی نظر اس گھر پر بھی تھی..... اس گھر کا بٹوارہ انہیں منظور نہ تھا..... انہوں نے گھر کے لئے وصیت بھی بنوالی تھی کہ ان کے بعد یہ گھر ''زینت گھر'' کے نام سے غریبوں کے لئے وقف ہوگا..... اس پر کئی دن سرد جنگ جاری رہی..... بہو بیٹے ناراض' ناراض رہنے لگے..... تب انہوں نے ہنس کر کہا.....

''تمام زندگی تمہارے والد نے جو کمایا' تمہاری پرورش' تعلیم و تربیت پر خرچ کردیا۔ میں نے جو بچایا وہ تمہاری خوشیوں پر لٹایا۔ اپنے لئے کچھ نہ رکھا، آج بھی جو کچھ تھا وہ تمہارے حوالے کردیا۔ اپنے لئے صرف یہ جھونپڑا رکھا ہے، جس کی تعمیر ہم دونوں نے بڑی خواہش اور آرزو سے کروائی تھی، اسی لئے مجھے یہ گھر زیادہ عزیز ہے۔ اور جو چیز زیادہ عزیز ہو وہی خدا کے نام پر صدقہ کی جاتی ہے۔ میں نے کسی کا حق نہیں مارا بیٹے، یہ مکان راہِ خدا میں دے کر اپنی روح کی تسکین کا تھوڑا سا سامان حاصل کرلیا ہے، اس سے تم سب ملال کیوں کرتے ہو؟ تم لوگوں کی اچھی خاصی جاب ہے، دو دوڈ کانوں کے مالک ہو۔ اب تم اپنے بچوں کے لئے جائیدادیں بناؤ۔ اپنا ورثہ نہیں دو۔''

زینت بیگم ایک ہنستا بستا ماحول دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر یہ ان کی آرزوٗ آرزو ہی رہ گئی، کیونکہ ان کے بیٹے اور بہویں ایک سے بڑھ کر ایک خودغرض اور موقع پرست واقع ہوئے تھے۔ ان یادوں کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو ڈھلنے لگے اور زینت بیگم کے حسین تصورات کا کمزور تانا بانا اُن کے آنسوؤں میں بہہ گیا، انہوں نے سرد آہ بھری اور آنسو پونچھتے ہوئے بے قراری سے زبان سے نکل گیا۔

''آہ! وہ خوشیاں..... وہ دن..... وہ عہد..... اب کہاں؟''۔

دونوں بہو بیٹے حسب معمول پھر خریداری کے لئے نکل گئے..... زینت بیگم نے آج افطار کے بعد کھانا بھی نہیں کھایا تھا..... صرف ایک کپ چائے پی تھی..... جاتے وقت شاہد اُن کو اطلاع دینے کے لئے آیا تو ہنستے ہوئے کہنے لگا.....

''اماں جان! کیسی طبیعت ہے.....؟ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔'' وہ ماں کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا۔

زینت بیگم کا دل بھر آیا۔ شاید عید کی وجہ سے وہ ماں کے قریب آ گیا تھا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا خوب جی بھر کر رولے۔ مگر یہ بھی ان کے بس میں نہ تھا۔ سو بولت سے کہنے لگیں۔

''کچھ نہیں بیٹا! رات نیند نہیں آئی، شاید اس لئے طبیعت بحال نہیں ہے..... ٹھیک ہوجاؤں گی، تم فکر نہ کرو۔''

''آپ نے نیند کی گولی کھانا کیوں بند کردی؟ اس سے بڑی پُرسکون نیند آتی ہے..... ہے ناں اماں جان!'' بیٹے نے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ نیند کی مسلسل گولیوں کے استعمال سے قدرتی نیند ختم ہوجاتی ہے، وہ سکون نہیں ملتا، اس لئے جب وہ زیادہ پریشان ہوتیں تب ہی گولی کھاتی تھیں..... اب اس وقت نیند کا کیا سوال' جب یادوں کی یلغار ان کے رگ و پے میں گذرے دنوں کی خوشیاں بھر دیتی تھیں..... غمِ روزگار کا ایک یہی تو علاج تھا اُن کے پاس' ورنہ جانے یہ تنہائیاں' محرومیاں' یہ دُکھ انہیں پاگل کردیتے یا پھر گھر بدر!

افسانے

ماضی کے یہی گل وگلزار، شوہر کی حسین یادیں ومحبتیں انہیں سنبھالے ہوئے تھیں، گھنٹوں ماضی کی یادیں تازہ کرتے گذر جاتے۔انہیں وقت گذرنے کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

آج عید کا چاند نظر آنے کا امکان تھا..... گھر میں عید کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں، زینت بیگم کے بھی دونوں بیٹوں نے ان کے لئے عید کے جوڑے بنائے تھے.....ان کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا تھا کہ سال میں جتنے کپڑے بناتیں، دوسرے سال وہ سارے کپڑے ضرورت مندوں میں تقسیم کردیتیں، ایک سیزن کے کپڑے دوسرے سیزن میں نہیں پہنتیں، مگر شوہر کے گذرنے کے بعد انہوں نے اپنی ضرورتوں کو محدود کرلیا تھا، ان کا نظریہ تھا کہ جتنی انسان کی ضرورتیں کم ہوں گی، اللہ میاں کو حساب بھی کم دینا ہوگا..... یہ لوگ جو مٹھی بھر بھر کر خرچ کرتے ہیں.....آدھا کھاتے ہیں، آدھا ضائع کرتے ہیں ..... بے انتہاء ضرورتیں بڑھا رکھی ہیں.....تقریبات، نمود و نمائش پر بے تحاشا دولت کا زیاں کرتے ہیں، یومِ حساب ان کی سخت پکڑ ہوگی، لیکن انہیں کسی قسم کا ملال ہی نہیں کہ کس کس کا حساب دے سکیں گے، یہی خوف زینت بیگم کو ہمیشہ الجھائے رکھتا.....اور وہ گھبرا کر اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں بانٹ دیتیں اور ذہنی طور پر مطمئن ہوجاتیں۔

عید کا چاند نظر آگیا تھا، سائرن کی آواز آرہی تھی.....فضاء میں بڑی دلکشی آگئی تھی، ہر چہرہ منور نظر آرہا تھا..... ہر طرف بڑی گہما گہمی ہورہی تھی۔

''کل عید ہے۔۔۔ انہوں نے سوچا۔لیکن جو خوشیاں کل بڑوں کے چہروں پر نظر آتی تھیں، آج وہ اطمینانِ قلب، وہ خوشیاں بچوں کو بھی میسر نہ تھیں، کیوں کہ آج کا ہر بچہ اپنے ساتھ مسائل لاتا ہے، اس لئے اس میں زیادہ احساس ذمہ داری ہے، حال سے زیادہ اُسے مستقبل کی فکر لاحق ہوتی ہے اور افکار ومسائل کے اس نہ ختم ہونے والے حالات میں بھلا سچی خوشیاں کہاں؟

زینت بیگم نے کچھ دیر کے لئے ماضی کا جھروکہ پھر بند کردیا اور حال میں واپس آگئیں۔انہوں نے دیکھا۔سارے چھوٹے بڑے بچے انہیں گھیرے بیٹھے ہیں۔اور سب اپنی مہربان دادی حضور کو عید کے کپڑے، جوتے اور تمام چھوٹی چھوٹی چیزیں دکھانے کے لئے بے تاب نظر آرہے تھے۔ان کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔انہوں نے بڑے شوق وذوق سے سب کی چیزیں دیکھیں۔خوب خوب تعریف کی، انہیں پیار آگیا، وہ ان کی معصوم خوشیوں میں بھرپور طور پر شریک ہونا چاہتی تھیں۔تاکہ ان کی عید کی مسرتوں کو دوبالا کرسکیں۔

سب کچھ ویسا ہی تھا، عید کی خوشیاں، اس کے انداز، ماہ وسال کے تقاضے۔موسم کی فسوں کاریاں۔مگر پہلے سی عید کہاں، جس کی البیلی سج دھج، پاکیزہ تصور آج بھی ان کے دل ودماغ پر چھایا ہوا تھا۔

☆☆☆

خیرالنساء علیم
حیدرآباد
9866613643

افسانے

# غزلیں

سردار سلیم

پھر اک فصیل صحن میں تعمیر کی گئی
پھر اک گھنے درخت کی جڑ کاٹ دی گئی

اس رات چل رہی تھیں بہت تیز آندھیاں
جس رات کو چراغ کی قسمت لکھی گئی

جب بھی میں لکھنے بیٹھوں سلگتی ہیں انگلیاں
یہ کیسی روشنائی قلم میں بھری گئی

سب مجھ سے سننا چاہتے ہیں اک انوکھی بات
جو آج تک کبھی نہ کہی اور سنی گئی

میں وہ ہوں جس کی اپنی ہی سانسوں کے تار سے
اپنے ہی دل کے زخموں کی پوشاک سی گئی

تقدیر ہے کہ یار کی پرپیچ زلف ہے
سلجھا یا جس قدر بھی الجھتی چلی گئی

میں زندگی سمجھتا رہا اس کو عمر بھر
لیکن وہ میری موت تھی جو مجھ کو جی گئی

میں چاہتا تو دیتا پلٹ کر کوئی جواب
وہ تربیت ہی تھی جو مرے ہونٹ سی گئی

اک معصیت نے چھین لی معصومیت سلیم
اک بوند تھی کہ سارے سمندر کو پی گئی

نزد دارنا اسکول' ڈیفنس وال' بالاپور روڈ'
چندرائن گٹہ' حیدرآباد۔

محمود شاہد

عشق کا سراب ہے ہجر کا عذاب ہے
زیست کی کتاب میں اک یہی نصاب ہے

داغ داغ صورتیں تار تار پیرہن
شرمسار حسن ہے سرنگوں شباب ہے

موسموں کے دست و پا تر بتر ہیں خون میں
سبز سبز جھیل میں سرخ سرخ آب ہے

زخم زخم سر زمیں اشک اشک آسماں
ظلمتوں کی خاک میں دفن ماہتاب ہے

کوئی شے وجود کی کارکرد ہی نہیں
جسم بھی خراب ہے روح بھی خراب ہے

دور تک نگاہ میں منظروں کا قحط ہے
چشم بے سحاب میں ایک خشک خواب ہے

شاہد اب تو ہی بتا کیا صحیح کیا غلط
یہ مرا سوال ہے یہ ترا جواب ہے

12/168' وسیلہ اُردو ٹی وی' ایم آر اسٹریٹ'
کڈپہ۔ 516001 اے پی۔

# غزلیں

اطیب اعجاز

زرؔ زمیں' زن' نہ حاشیہ رکھنا
اپنی گٹھری میں تجربہ رکھنا

رابطہ ہر گھڑی روا رکھنا
ذہن میں لفظِ ارتقا رکھنا

عیب اوروں کے ڈھونڈنے والے
روبرو خود کے آئینہ رکھنا

ظلمتوں کے گھنے اندھیروں میں
آگہی کا دیا جلا رکھنا

کامیابی کی گر تمنا ہو
اپنے ہونٹوں پہ تم دعا رکھنا

صبر مرہم ہے سارے زخموں کا
حوصلہ تم میاں ذرا رکھنا

تیری قسمت کا تجھ کو ملتا ہے
آس اس سے نہ تو سوا رکھنا

رب کی مرضی کو رکھ نگاہوں میں
زندگی سے نہ کچھ گلہ رکھنا

9-10-241 ' رسالہ بازار قلعہ گولکنڈہ ' حیدرآباد۔8
فون نمبر: 9849339588

طاہر سعود کرتپوری

سورج کی ہتھیلی پہ سفر کون کرے گا
میدان جنوں ہوش میں سر کون کرے گا

جب عشق کی سر حد پہ کوئی روک نہ ہو گی
پھر عشق کی دیوار میں در کون کرے گا

ہر شخص کی آنکھوں میں غرض رقص کرے ہے
اب شہر دل ماہ میں گھر کون کرے گا

وہ پانی میں دیوار اٹھانے کے ہیں ماہر
اس شوق کو اب روز ہنر کون کرے گا

رپیے میں چلا کرتی ہے عاشق کی چوّنی
اس رخ پہ رخِ ناز نظر کون کرے گا

اس نے جو جفا کی تو ملی پہلی محبت
محسن کو کرامت کی خبر کون کرے گا

اف چہرے کے ہاتھوں کو لکھا تو نے گلِ سرخ
یوں ترش کو جز تیرے شکر کون کرے گا

بس اس لئے اس شخص سے اپنائی ہے دوری
اک زیر کو ہر بار زبر کون کرے گا

اپنے سے بڑا مان لے اپنے سے بڑے کو
اس درجہ بڑا قلب و جگر کون کرے گا

پتہ قصبہ کرتپور ضلع بجنور یوپی الہند

سعداللہ خان سبیلؔ

# غزل

حوصلہ ہار گئے اس کو روانہ کرکے
روپڑے آنکھ میں تنکے کا بہانہ کرے

کوئی تدبیر نہ عامل ہی کوئی کام آیا
مفلسی بیٹھ گئی گھر میں ٹھکانہ کرے

کوئی حاجت بھی نہیں کوئی تمنا بھی نہیں
مدتیں بیت گئیں ترک زمانہ کرے

اس کی آنکھوں کی کتابوں میں یہی لکھا تھا
ہم نے چھوڑے ہیں کئی لوگ دوانہ کرے

جب وہ آتے ہیں تو ماحول مہک اٹھتا ہے
اور جاتے ہیں تو موسم کو سہانہ کرے

نامرادی تھی لکھی اپنے مقدر میں سبیلؔ
دل میں غم بیٹھ گئے ٹھور ٹھکانہ کرے

مکان نمبر: 96-5-19 ' این ایم گوڑہ ' بہادر پورہ ' حیدرآباد۔ 064 500
موبائل: 9394486244

فرید سحر

# مزاحیہ نظم

بات اک راز کی اب میں ہوں بتانے والا
شعر اُستاد کے ڈٹ کر ہوں سُنانے والا

جب ترنم سے میں پڑھتا ہوں تو کہتے ہیں یہ سب
لو فقیر آ گیا سحری کو جگانے والا

عید ملنے کو وہ میکے کو گئی ہے جب سے
گھر میں اب کوئی نہیں مجھ کو ڈرانے والا

بن گیا سالے کا سالا جو منسٹر یارو
خود کو میں کہتا ہوں اب اُونچے گھرانے والا

کس طرم خاں میں ہے دم آ کے جو مارے مُجھ کو
''مارنے والے سے بڑھ کر ہے بچانے والا''

گھر کا ہر فرد مری قدر بہت کرتا ہے
ایک میں ہی تو ہوں گھر میں جو کمانے والا

پٹ گیا باتوں میں یاروں کی میں آ کر لوگو
اب میں باڑوں میں کسی کے نہیں آنے والا

ایک نیتا بھی نظر آتا نہیں کام کا اب
جو بھی نیتا ہے وہ ہے کھیر پچانے والا

داد جی بھر کے مُجھے دیجیے محفل میں سحر
ورنہ محفل سے میں اُٹھ کر نہیں جانے والا

مکان نمبر 20-7-21/A/1 ' اندرون فتح دروازہ ' حیدرآباد۔ 500065
موبائل: 9848084306

جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر ریاستی تلنگانہ اُردو اکیڈیمی نے 82ویں کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد میں اُردو اکیڈیمی کے بک اسٹال کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب محمد مسیح اللہ خان چیرمین تلنگانہ وقف بورڈ، جناب امتیاز الحق چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن، مسٹروی۔ کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی سینئر عہدیداران جناب شیخ جعفر، جناب عطاءاللہ خان ارکان عملہ ومحبان اُردو دیکھے جاسکتے ہیں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر ریاستی تلنگانہ اُردو اکیڈیمی صنعتی نمائش میں اردو اکیڈیمی کے بک اسٹال کا معائنہ کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب محمد مسیح اللہ خان چیرمین تلنگانہ وقف بورڈ، جناب امتیاز الحق چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن ودیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں

جناب محمد مسیح سپرنٹنڈنٹ کمشنریٹ اقلیتی بہبود اور مسٹروی کرشنا سپرنٹنڈنٹ نے جناب شاہنواز قاسم آئی پی ایس کو انسپکٹر جنرل آف پولیس ملٹی زون مقرر کئے جانے پر مبارکبادی اور گلدستہ پیش کیا۔
تصویر میں جناب محمد عطاءاللہ خان اکاؤنٹنٹ اردو اکیڈیمی بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

مسٹروی کرشنا سپرنٹنڈنٹ اور جناب محمد عطاءاللہ خان اکاؤنٹنٹ اردو اکیڈیمی نے جناب بی۔ شفیع اللہ آئی ایف ایس کوڈائرکٹر اقلیتی بہبود اور ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی مقرر کئے جانے پر مبارکبادی اور گلدستہ پیش کیا۔

Urdu Monthly
# Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Vol. 08 No. 1 January 2023

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

ریاست تلنگانہ کی اول خاتون چیف سکریٹری محترمہ اے۔ سانتی کماری آئی اے ایس نے جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ سے ملاقات کی اور انہیں چیف سکریٹری کے عہدہ پر فائز کرنے پر اظہار تشکر کیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone: 040-23237810, 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com